

لااکراہ فی الدین

مولانا عبد العلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبۃ الاقصی





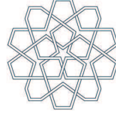
لَااِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ

(۲۰۱۲ء)



مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

فہرستِ مضامین





عرضِ ناشر



یہ مختصر کتابچہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے اس میں قرآن مجید کی چند آیات پر حالات کے تناظر میں علمی انداز میں گفتگو کی گئی ہے جس سے کئی قرآنی حقائق واشگاف ہورہے ہیں اور دورِ حاضر کی کئی فکری گمراہیوں کا پردہ چاک ہورہا ہے۔

امید ہے کہ اہلِ نظر اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور مطالعۂ قرآن کرنے والے خاطر خواہ استفادہ کریں گے۔

اللہ سے دعا ہے کہ ہر خاص وعام کے لیے اس کتابچہ کو نافع بنائے۔ آمین!

ناشر

مکتبۃ الاقصیٰ



لَاۤ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ



سورۃ البقرہ آیت 256 کا ایک فقرہ ہے...... "لَاۤ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ"
جس کا ترجمہ ہے...... ''زبردستی نہیں دین کے معاملہ میں'' (تفسیر شیخ الہند)
''دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں'' (احسن التفاسیر)

اس فقرہ کا استعمال تحریر وتقریر میں اکثر لوگ کرتے ہیں لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اکثر استعمال آیت کے منشاء ومراد کے خلاف ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس فقرہ کے ذریعہ دین کی کئی حقیقتوں کا انکار کردیا جاتا ہے اور کئی ذمہ داریوں سے اپنا دامن بچا لیا جاتا ہے نتیجہ کے طور پر دین کا اصل چہرہ مسخ ہوکر رہ جاتا ہے اور پھر دین اسلام راہبوں اور بھکشوؤں کا مذہب بن کر رہ جاتا ہے۔

آیت کا صحیح معنی ومفہوم کیا ہے اس سوال کا جواب ہم معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ بات اتنی آسان نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں۔

"لَاۤ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" کی تفسیر میں مفسرین کی کئی رائیں ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد اور باہم آپس میں ٹکرانے والی ہیں بحوالہ فتح القدیر ہم ان کو یہاں درج کرتے ہیں:

① یہ آیت بہت سے مفسرین کے نزدیک منسوخ ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل عرب کو دین اسلام پر ایمان لانے کے لئے مجبور کیا اور ان سے جنگ کی اور اسلام کے سواء کسی دوسری چیز پر راضی نہیں ہوئے۔ منسوخ کرنے والی آیات حسب ذیل ہیں:

یَآ أَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِینَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ (التحریم:۹)

ترجمہ: اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد جاری رکھو اور ان پر سخت ہوجاؤ۔

یَآ أَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَکُمْ مِّنَ الْکُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا فِیْکُمْ غِلْظَةً (التوبۃ:۱۲۳)

ترجمہ: اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس پاس ہیں اور ان کو تمہارے اندر سختی پانا چاہئے۔

سَتُدْعَوْنَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ. (الفتح:١٦)

ترجمہ: عنقریب تم ایک سخت جنگجو قوم کی طرف بلائے جاؤ گے کہ تم ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہو جائینگے۔

٢) آیت منسوخ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق خاص طور پر اہل کتاب سے ہے جب کہ وہ جزیہ ادا کریں گے تو انہیں مجبور نہیں کیا جائے گا مجبور صرف بت پرستوں کو کیا جائے گا ان کے لئے صرف دو ہی راستے ہیں اسلام یا تلوار، امام شعبی، حسن، قتادہ اور ضحاک کی یہی رائے ہے۔

٣) یہ آیت صرف انصار سے متعلق ہے جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انصار کے کچھ جوان یہودی اور عیسائی ہو گئے تھے جب یہ انصار مسلمان ہو گئے تو انہوں نے اپنی نوجوان اولاد کو زبردستی مسلمان بنانا چاہا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

٤) آیت کے معنی یہ ہیں کہ تلوار کے ڈر سے جو لوگ ایمان لائیں انہیں مکرہ نہ کہو۔

٥) یہ آیت اہل کتاب قیدیوں کے بارے میں ہے۔

٦) ابن کثیرؒ نے کہا کہ کسی کو دائرہ اسلام میں لانے کے لئے مجبور نہ کرو اس لئے کہ مجبوری کی حالت میں اسلام قبول کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

٧) صاحب کشافؒ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کا معاملہ اختیار اور پسند پر رکھا ہے اسی قانون کو لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ میں بیان کیا گیا ہے ورنہ اللہ اگر چاہتا تو سب کو قبولیت اسلام کے لئے مجبور کر سکتا تھا۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَن فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا. (یونس:٩٩)

ترجمہ: اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لے آتے۔

اختلاف کے کئی اسباب ہیں:

١) قرآن میں 'وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ'، 'وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ' اور 'وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ' متعدد مقامات پر آیا ہے جس کا صاف مطلب ہے کافروں، مشرکوں اور مجرموں کی مرضی اور پسند کے خلاف اللہ کا حکم اور فیصلہ جاری اور نافذ کیا جائیگا۔ یعنی دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں کے اصول پر انہیں ان کی مرضی کے مطابق آزاد دندناتے ہوئے چھوڑ نہیں دیا جائے گا۔

٢) جہاد و قتال کا حکم ایک مستقل حکم ہے اور ایک محکم فریضہ ہے جس کو کوئی منسوخ نہیں کر سکتا جو

منسوخ کرے گا وہ دائرۂ اسلام سے خارج قرار پائے گا۔ مثلاً غلام احمد قادیانی وغیرہ۔

اس حکم کی ادائیگی بقدر قلیل فرق کے ساتھ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے مانند فرض ہے اور یہ حکم قیامت تک باقی رہے گا۔ اَلْجِھَادُ مَاضٍ اِلٰی یَومِ الْقِیَامِۃِ۔

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ (البقرۃ:۲۱۶)

ترجمہ: جہاد تم پر فرض کیا گیا گو وہ تمہیں دشوار معلوم ہو۔

وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔ (الانفال:۳۹)

ترجمہ: اور تم ان سے اس حد تک لڑو کہ فتنہ نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کیلئے ہو جائے۔

اس آیت میں فتنہ سے مراد شرک ہے اللہ کیلئے دین کے ہو جانے کا اس کے سوا کیا مطلب ہے کہ حکم صرف اللہ کا چلے، حکمرانی صرف اسی کی ہو۔ ایسی صورت میں سرکشوں کو مجبور کرنا بالکل لازمی ہوگا۔ دین میں کوئی زبردستی نہیں والی بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: ان لوگوں سے لڑو جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ شئے کو حرام قرار نہیں دیتے اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی۔ یہاں تک کہ وہ ذلیل و خوار ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔

فطرت سے اس صفت کو نکالا نہیں جا سکتا۔ جو دین انسانی زندگی کے مسائل سے تعلق رکھتا ہے وہ بھلا زور زبردستی استعمال کرنے سے خالی کیسے رہ سکتا ہے۔ زندگی سے تعلق رکھنے والے ادیان اور نظریات ہمیشہ پولیس اور فوج اسی لئے رکھتے ہیں کہ اس کے بغیر وہ ایک دن بھی باقی نہیں رہ سکتے۔ ماضی اور مستقبل سے قطع نظر آج دیکھئے کوئی ملک یا کوئی ایسا نظام ہے جو پولیس اور فوج سے بے نیاز ہو؟ یہ کشمکش کی دنیا ہے جس کے پاس زور نہیں وہ ایک لمحہ کے اندر نیست و نابود ہو جائیگا۔ یہ فرشتوں کی دنیا نہیں ہے جہاں خیر و شر کی کشمکش ناپید ہو۔ اسلام جو شر کے مقابلہ میں خیر کو، باطل کے مقابلہ میں حق کو اور منکر کے مقابلہ میں معروف کو رائج و قائم کرنے کا داعی ہے وہ زور اور قوت استعمال نہ کرنے کے غیر فطری تصور کا حامل کیسے ہو سکتا ہے۔ اسلام دین فطرت ہے وہ فطری قوت کو ختم کرنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ اس کو صحیح طور پر استعمال کی تعلیم دیتا ہے۔

اسلام میں قوت جمع کرنے، قوی بننے کی ترغیب و تعلیم دی گئی ہے: وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ (الانفال:۶۰)۔ پھر قوت و طاقت کے ذریعہ معروف کے قیام اور بدی کو ختم کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ عاجزی، بےبسی اور بزدلی سے پناہ مانگنے کی دعاء سکھائی گئی ہے۔ علم کے ساتھ ساتھ زور آور جسم کو قیادت کیلئے مستحسن قرار دیا گیا ہے۔ "بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ" ایک حدیث ہے کہ قوی مسلمان ضعیف مسلمان سے بہتر ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے مطابق زیر بحث آیت میں فطری جبر کی نفی کی گئی ہے یعنی شرعی قانون نہیں بتایا گیا ہے بلکہ تکوینی قانون بتایا گیا ہے۔ اس تفسیر سے سارے اختلافات کی جڑ ختم ہو جاتی ہے۔

چنانچہ مولانا لکھتے ہیں......

> ''اس سے واضح ہوتا ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے ٹکڑے میں جس جبر واکراہ کی نفی کی گئی ہے اس سے مقصود جبر فطری کی نفی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہدایت وضلالت کے معاملہ میں یہ طریقہ نہیں اختیار فرمایا ہے کہ وہ اپنی مشیت وقدرت کے زور سے لوگوں کو ہدایت پر چلا دے یا گمراہی کی طرف ہانک دے اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو اس کا ہاتھ پکڑنے والا تو کوئی نہیں تھا لیکن یہ بات اس کی حکمت اور اس کے عدل کے خلاف ہوتی ہے۔''



لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْن



"لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْن"۔ یہ سُوْرَۃُ الْکٰفِرُوْنَ کا ایک فقرہ ہے۔

امام فخر الدین رازیؒ کے مطابق یہ فقرہ آپس میں قطع تعلق کے اظہار کے لئے بطور ضرب المثل لوگ بولتے ہیں یہ مناسب نہیں ہے۔ قرآن تدبر و تفکر کے لئے اُتارا گیا ہے ضرب المثل کے لئے نہیں۔

"جرت عادة الناس بان یتمثلوا بھذہ الایة و ذلک غیر جائز لان اللّٰہ تعالٰی ماانزل القراٰن لیتمثل بہ بل لیتدبر بہ ولیعمل بموجبہ" (تفسیر فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ)

اس کے برخلاف ہمارے اس دور میں بسا اوقات رواداری، مصالحت، قومی یکجہتی، بقائے باہم اور سیکولر نظریہ کی تائید میں لوگ اس فقرہ کو پیش کرتے ہیں۔

اس فقرہ کا صحیح مفہوم جاننے کیلئے مجموعی طور سے اس پوری سورہ کے مضمون کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس کیلئے مفسرین کے چند اقتباسات ہم پیش کرتے ہیں۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ لکھتے ہیں:

''یہ جنگ اور برأت کی سورۃ ہے''

یہ سورہ کفار سے علیحدگی اور قطع تعلق کی سورہ ہے۔ اس وجہ سے اس کو سورۂ برأت کی طرح ہجرت اور جنگ کی سورہ سمجھنا چاہئے۔ سورۂ برأت فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی اور یہ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ سورۂ برأت کا صرف ابتدائی حصہ اعلان برأت ہے اور یہ پوری کی پوری اعلان برأت ہے۔ سلف نے بھی اس سورہ کی حقیقت یہی سمجھی ہے۔ چنانچہ اس کے مختلف ناموں سے جو منقول ہے، اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

اس سورہ کا نام سورہ منابذہ، سورہ اخلاص اور سورہ مقشقشہ ہے۔ لسان العرب میں ہے کہ ''احادیث میں وارد ہے کہ سورہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اور قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ کا نام مقشقشان تھا۔''

مختصراً مذکورہ ناموں کی تشریح سن لینی چاہئے۔ اس سے اس سورہ کی صحیح تاویل کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ منابذہ کا

مطلب ہے کسی سے تمام تعلقات کو کاٹ لینا۔قرآن میں ہے فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ (توتم بھی ان کے معاہدہ کو ان کے منہ پر پھینک مارو) اخلاص کے معنی ہیں، مومنین کو مشرکین سے علیحدہ کرنا۔

جیسا کہ فرمایا ہے:

وَلِیُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَمْحَقَ الْكٰفِرِیْنَ (آل عمران:۱۴۱)

ترجمہ: اور تا کہ اللہ مومنین کو چھانٹ لے اور کافروں کو مٹا دے۔

یہی چیز انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصود ہے۔تفصیل اس کی آگے آئے گی۔

اخلاص کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اخلاص باطن، اخلاص ظاہر کا سبب بنتا ہے۔اخلاص باطن کی جڑ توحید ہے۔اس وجہ سے توحید ہی مشرکین سے علیحدگی کی اصلی علت ہوگی۔اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

مقشقشه، وہ سورہ جو قرب صحت اور نجاست شرک سے علیحدگی کی خبر دے رہی ہو۔قشقشہ کے معنی ہیں ظہور صحت کے چیچک اور زخم وغیرہ کے اچھے ہوجانے کے بعد جب جلد سوکھ جاتی ہے تو اس کی تعبیر کے لئے عربی میں یہی لفظ ہے۔

غور کرو کہ یہ لفظ برأت کی حقیقت کی تعبیر کے لئے کس قدر موزوں ہے۔ہجرت، برأت اور جنگ بظاہر نہایت گھناؤنی اور مکروہ چیزیں ہیں لیکن انہی پردوں کے اندر سے سعادت و کامرانی کا صحت مند چہرہ نمایاں ہوتا ہے۔اس اعتبار سے یہ نام سورہ کے اصلی مفہوم سے نہایت گہری مناسبت رکھنے والے ہیں۔

قرآنِ مجید نے حضرت محمد ﷺ کو ابتدائے نبوت ہی میں حکم دے دیا تھا کہ جب یہ لوگ تمہاری بات ماننے سے انکار کردیں تو تم ان سے اپنی علیحدگی کا اعلان کردینا۔چنانچہ سورہ شعراء میں ہے:

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ○ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ○
فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ○ وَتَوَكَّلْ عَلَی الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ○
(الشعراء:۲۱۴-۲۱۷)

ترجمہ: اور اپنے قرابت داروں کو ڈراؤ اور جن مومنین نے تمہاری پیروی کی ہے ان پر شفقت کرو۔پس اگر وہ (کفار) تمہاری بات نہ مانیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تمہارے اعمال سے بری ہوں اور خدائے عزیز و رحیم پر بھروسہ کرو۔

سورۂ یونس میں فرمایا:

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّیْ عَمَلِیْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِیْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ○ (یونس:۴۱)

ترجمہ: اگر وہ تمہیں جھٹلا دیں تو ان سے کہہ دو کہ میرے لئے میرا عمل ہے اور تمہارے لئے تمہارا عمل۔ تم میرے عمل سے بری ہو۔ اور میں تمہارے عمل سے بری ہوں۔

یہ آیت بالکل لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کے ہم معنی ہے۔

سورۂ انبیاء میں فرمایا:

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُکُمْ عَلٰی سَوَآءٍ وَاِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ

(الانبیاء:۱۰۹)

ترجمہ: اگر وہ اعراض کرلیں تو کہہ دو کہ میں نے تمہیں عام طور پر خبردار کر دیا اور میں نہیں جانتا کہ جس چیز کی تمہیں دھمکی دی جارہی ہے وہ قریب ہے یا دور ہے۔

پس جب مکہ اور اس کے اطراف کے کفار نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے انکار کر دیا اور نفرت وعداوت کے جوش میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کر دینے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکال دینے پر کمر بستہ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو برأت اور ہجرت اور جنگ کا حکم دے دیا۔

انبیائے کرام کی دعوت وتبلیغ کے معاملہ میں قانون الٰہی ہمیشہ سے یوں ہی رہا ہے۔ ایک مدت تک ان کو صبر وتحمل اور انتظار فتح ونصرت کا حکم دیا جاتا ہے ممکن ہے سرکش طبیعتیں کچھ بدلیں اور لوگ دعوت کو قبول کرلیں۔ لیکن جب ان کی طرف سے برابر سرکشی ہی کا اظہار ہوتا رہتا ہے اور یہ سرکشی آہستہ آہستہ پیغمبر کے ارادۂ قتل واخراج تک متعدی ہونے لگتی ہے تو خدا کا آخری حکم برأت اور ہجرت اور جنگ کے اعلان اور انتقام کے تازیانہ کے ساتھ نمودار ہوجاتا ہے۔ یہ وقت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے ہوتے ہیں۔ ظالم ہلاک ہوتے ہیں اور ان کی جگہ اہل ایمان خدا کی زمین پر قابض ہوتے ہیں۔ یہی بعثت کی اصل غرض ہے۔‘‘

(تفسیر نظام القرآن، صفحہ: ۴۶۵ تا ۴۶۷)

تاریخی پس منظر

’’مکہ معظّمہ میں ایک دور ایسا گذرا ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام کے خلاف قریش کے مشرک معاشرے میں مخالفت کا طوفان تو برپا ہو چکا تھا لیکن ابھی قریش کے سردار اس بات سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نہ کسی طرح مصالحت پر آمادہ کیا جاسکے گا۔ اس لئے وقتاً فوقتاً وہ آپ کے پاس مصالحت کی مختلف تجویزیں لے لے کر آتے رہتے تھے تاکہ آپ ان میں سے کسی کو مان لیں اور وہ نزاع ختم ہوجائے جو آپ کے اور ان کے درمیان رونما ہوچکی تھی۔ اس سلسلہ میں متعدد روایات احادیث میں منقول ہوئی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہم آپ کو اتنا مال

دیئے دیتے ہیں کہ آپ مکہ کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی بن جائیں۔ آپ جس عورت کو پسند کریں اس سے آپ کی شادی کئے دیتے ہیں۔ ہم آپ کے پیچھے چلنے کے لئے تیار ہیں، آپ بس ہماری یہ بات مان لیں کہ ہمارے معبودوں کی برائی کرنے سے باز رہیں۔ اگر یہ آپ کو منظور نہیں تو ہم ایک اور تجویز آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں آپ کی بھی بھلائی ہے اور ہماری بھی۔ حضور ﷺ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا ایک سال آپ ہمارے معبودوں لات اور عزیٰ کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اچھا۔ ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں کہ میرے رب کی طرف سے کیا حکم آتا ہے۔ اس پر وحی نازل ہوئی۔'' (تفہیم القرآن صفحہ: ۵۰۰، جلد: ششم)

مولانا مودودیؒ پھر لکھتے ہیں:

''اس پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ مذہبی رواداری کی تلقین کے لئے نازل نہیں ہوئی تھی جیسا کہ آج کل کے بعض لوگ خیال کرتے ہیں بلکہ اس لئے نازل ہوئی تھی کہ کفار کے دین اور ان کی پوجا پاٹ اور ان کے معبودوں سے قطعی برأت، بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان کر دیا جائے اور انہیں بتا دیا جائے کہ دین کفر اور دین اسلام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ان کے باہم مل جانے کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات اگرچہ ابتداءً قریش کے کفار کو مخاطب کر کے ان کی تجاویز مصالحت کے جواب میں کہی گئی تھی لیکن یہ انہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اسے قرآن میں درج کر کے تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لئے یہ تعلیم دے دی گئی ہے کہ دین کفر جہاں جس شکل میں بھی ہے ان کو اس سے قول اور عمل میں برأت کا اظہار کرنا چاہئے اور بلا رو رعایت کہہ دینا چاہئے کہ دین کے معاملہ میں وہ کافروں سے کسی قسم کی مداہنت یا مصالحت نہیں کر سکتے۔ اسی لئے یہ سورہ اس وقت بھی پڑھی جاتی تھی جب وہ لوگ مرکھپ گئے تھے جن کی باتوں کے جواب میں اسے نازل فرمایا گیا تھا اور وہ لوگ بھی مسلمان ہونے کے بعد اسے پڑھتے رہے جو اس کے نزول کے زمانے میں کافر و مشرک تھے اور ان کے گزر جانے کے صدیوں بعد آج بھی مسلمان اس کو پڑھتے ہیں کیونکہ کفر اور کافری سے بیزاری و لاتعلقی ایمان کا دائمی تقاضا ہے۔''

(تفہیم القرآن، جلد: ششم، صفحہ: ۲۰۵)

اب ہم زیر بحث آیت پر گفتگو کریں گے۔ ایک رائے یہ ہے کہ دین سے مراد عمل ہے جیسا اس سے ملتی جلتی قرآن میں دوسری جگہ چند آیات آئی ہیں۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ○ (البقرۃ:۱۳۹)

ترجمہ: اے نبی! ان سے کہو: کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ وہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں، تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ اور ہم اللہ ہی کے لئے

اپنی بندگی کو خالص کر چکے ہیں۔

وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِيْنَ ○(القصص:۵۵)

ترجمہ: اور جب انہوں نے بیہودہ بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ ''ہمارے اعمال ہمارے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے۔تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔''

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَّاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ○
(الشوریٰ:۱۵)

ترجمہ: اس لئے اے محمد! اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو، اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اسی پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ اور ان لوگوں کی خواہشات کی اتباع نہ کرو اور ان سے کہہ دو: ''اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، ہمارے اعمال ہمارے لئے، تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ ایک روز ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے''۔

ان تینوں مقامات کے آگے پیچھے، سیاق وسباق کو نظــــر میں رکھئے اور غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان آیتوں میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا جا رہا ہے کہ آپ اپنے مخالفین کو صاف صاف بتا دیجئے کہ ہم صرف اللہ کی بندگی پر اٹل ہیں اس راہ استقامت سے ہٹنے والے نہیں ہیں اور ہم کو تم سے زیادہ بحث ومباحثہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک دن آئے گا کہ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے ہم اپنے اعمال کا بہترین بدلہ اور انعام پالیں گے اور تم اپنے اعمال کے انجام سے دوچار ہو گے۔ ہم تم جیسے جاہلین سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں رکھتے۔

کوئی ایک لفظ ایسا نہیں جس سے اشارہ ہوتا ہو کہ اہل اسلام اور اہل کفر کے درمیان ہم آہنگی اور یکسانیت ہونی چاہئے۔ ہم دونوں گروہ اپنی جگہ خوش خوش رہیں کوئی وجہ اختلاف نہ ہے اور نہ ہونی چاہئے طور طریقہ کچھ الگ الگ ہے تو کیا فرق پڑتا ہے سب کی منزل ایک ہے۔

دوسری رائے ہے کہ دین سے مراد دین وشریعت ہے۔ اس آخری آیت سے پہلے آٹھ بار لفظ عبادت سے بنے ہوئے صیغے استعمال ہوئے۔ یہ بتانے کیلئے کہ عبادت، طریقۂ عبادت اور معبود ہر لحاظ سے تم الگ ہو اور ہم الگ ہیں۔ لیکن آخری آیت میں عبادت کے بجائے دین کا لفظ آیا ہے۔ عبادت، طریقۂ عبادت اور معبود کے

اعتبار سے دونوں گروہ ایک دوسرے سے جدا ہیں بات پوری ہوگئی تھی مگر لفظ دین نے مکمل طور پر علیحدگی اور جدائی کا اس طرح اعلان کر دیا کہ زندگی کے کسی حصہ اور جزء میں ملاپ، جوڑ، تعلق اور اتصال حتیٰ کہ مشابہت کی بھی گنجائش نہیں ہے۔عقیدہ، عبادت سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں اسلام اور کفر کی راہیں الگ الگ ہیں۔

یہ قرآن کی بیان کردہ حقیقت ہے اور نہایت تاکیدی طور پر بتایا ہوا اصول ہے جس کو توڑنے اور جس کی مخالفت کرنے کی ہمت کسی مسلمان کو نہیں کرنی چاہئے۔لیکن اس قرآنی اصول کو توڑنے کی جسارت اور ارادہ کچھ لوگ دعوت کے نام پر برملا کرتے ہیں اور مختلف طریقوں سے اصل کفر کے قریب ہونے کی کوشش کرنے کے لئے ان کے تہواروں میں شرکت کرتے ہیں اور تاویل کرتے ہیں کہ اس میں کوئی شرک کی بات نہیں ہے کچھ لوگ ان کے تہواروں کی تقسیم کرتے ہیں کہ ان کے فلاں فلاں تہواروں کا تعلق عقیدہ سے نہیں بلکہ موسم سے ہے اس لئے ان میں شرکت جائز ہے۔قرآن کے اتنے تاکیدی حکم کے مقابلہ میں بغیر کسی قرآنی آیت اور سنت ثابتہ کے جواز کی بات انتہائی خطرناک ہے۔

اس موقع پر ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ یہ اعلان برأت آخری زمانہ میں اتمام حجت کے بعد کیا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اتمام حجت سے پہلے کب اور کہاں ان سے جڑے رہنے، ملے رہنے اور ان سے مشابہت اور مماثلت اور یکسانیت قائم کرنے کی ہدایت دی گئی؟؟ اولاً تو اتمام حجت کا نظریہ کہاں سے لیا گیا مکہ کے علاوہ کس شہر، کس ملک اور کس علاقہ میں ۱۳ سال تک اتمام حجت کرنے کے بعد آگے قدم بڑھایا گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی معاملہ میں آخری ہدایت اور آخری نبوی عمل کو دیکھا جاتا ہے اور اس کو اسوہ بنایا جاتا ہے۔شروع کے مراحل کو نمونہ نہیں بنایا جاتا ہے۔مثال کے طور پر شراب کی حرمت کو لیجئے، شراب کی حرمت کئی مرحلوں سے گزری، پہلے کہا گیا کہ شراب میں نفع کم نقصان زیادہ ہے۔ پھر کہا گیا کہ شراب پی کر نماز نہ پڑھو۔ پھر حکم آیا شراب حرام ہے۔اس کے قریب نہ جاؤ اور اس سے مکمل اجتناب کرو۔شراب کے بارے میں اگر کوئی کہے کہ ایمان لانے کے کئی سال تک مسلمان شراب پیتے رہے اس لئے آج کوئی اسلام قبول کرتا ہے تو وہ کم از کم تیرہ سال تک شراب پی سکتا ہے۔شروع شروع نماز میں سلام کلام جائز تھا اس لئے کوئی نومسلم کچھ دنوں تک نماز میں سلام و کلام کرسکتا ہے تو کیا اس دلیل کو تسلیم کیا جاسکتا ہے؟!

دعوت کے نام پر ایک اور مصالحت کی صورت نکالی گئی ہے۔ دین اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہے اور اس سے بھی انکار نہیں کہ دین کے بعض حصہ کو لینا اور بعض کو چھوڑ دینا بھی جائز نہیں۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ دین کے بعض حصہ کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا کفر کے برابر ہے۔ "اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ" لیکن حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ماڈرن فارمولہ کو اس دور میں اہل

دین نے قبول کرلیا۔ وہ یہ کہ اہل اقتدار پرائیوٹ زندگی سے متعلق مسائل سے تعرض نہیں کریں گے اہل دین کو ان کے پرسنل لاء میں آزادی ہوگی اور اہل دین زندگی کے اجتماعی معاملات میں اور حکومت اور سیاست میں دین کے نام پر دخل نہیں دیں گے۔ یہ فارمولہ اس دور کا کامیاب فارمولہ ثابت ہوا۔ مشرق سے مغرب تک اس کو اہل دین نے قبول کرلیا ہے۔ افسوس کہ اہل عرب بالخصوص اہل مکہ کو یہ تجویز نہیں سوجھی۔ یہ سیکولرزم کا فارمولہ ہے۔

ع افسوس کہ مشرکین کو سیکولرزم کی نہ سوجھی

ورنہ سارا جھگڑا ہی ختم ہوجاتا، اہل دین کے مصنّفین، مؤلفین، سیرت نگار، اور خطباء و مقررین بہترین الفاظ اور شاندار فصیح و بلیغ جملوں میں لکھتے ہیں بولتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل زندگی کا نظام ہے ہمارے نبی ﷺ کی سیرت پوری زندگی کیلئے اسوہ کاملہ ہے پھر بھی ان کو اپنے قول و فعل میں تضاد نظر نہیں آتا ہے۔ اہل دین اور اہل اقتدار دونوں اپنی جگہ خوش و مطمئن ہیں کہ چلو بات بن گئی جھگڑا ختم ہوگیا۔ کچھ ماڈرن لوگ جو عصری زبان و اسلوب اور جدید اپروچ کو اختیار کرتے ہوئے دوقدم آگے بڑھ کر مسجد اور اپنے خصوصی اجتماعات اور جلسوں میں اصلاح عقیدہ، اصلاح معاشرہ اور دعوت و تبلیغ کے فضائل بیان کرنے کے ساتھ میدان عمل میں نکل کر شیطانی اور طاغوتی نظام کے فضائل اور خوبیاں بھی بیان کرتے ہیں الحاد و کفر کی بنیادوں پر بنے ہوئے نظاموں کی وکالت کرتے ہیں ان کے استحکام اور قیام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور اس کے باوجود......

ع نہ ایمان جائے، نہ ایمان بگڑے!!

اس آیت پر صاحب تفہیم القرآن نوٹ لکھتے ہیں:

''یعنی میرا دین الگ ہے اور تمہارا دین الگ۔ میں تمہارے معبودوں کا پرستار نہیں اور تم میرے معبود کے پرستار نہیں ہو۔ میں تمہارے معبودوں کی بندگی نہیں کرسکتا اور تم میرے معبود کی بندگی کے لئے تیار نہیں ہو۔ اس لئے میرا اور تمہارا راستہ کبھی ایک نہیں ہوسکتا۔ یہ کفار کو رواداری کا پیغام نہیں ہے بلکہ جب تک وہ کافر ہیں ان سے ہمیشہ کے لئے برأت، بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان ہے اور اس سے مقصود ان کو اس امر سے قطعی اور آخری طور پر مایوس کردینا ہے کہ دین کے معاملہ میں اللہ کا رسول ﷺ اور اس پر ایمان لانے والوں کا گروہ کبھی ان سے کوئی مصالحت کرے گا۔ یہی اعلان برأت اور اظہار بیزاری اس سورۃ کے بعد نازل ہونے والی مکی سورتوں میں پے در پے کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ یونس میں فرمایا ''اگر یہ تجھے جھٹلاتے ہیں تو کہہ دے کہ میرا عمل میرے لئے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لئے، جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بری ہو اور جو کچھ تم کررہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں۔'' (آیت ۴۱) پھر آگے چل کر اسی سورہ میں فرمایا: اے نبی کہہ دو کہ لوگو!......اگر تم میرے دین کے متعلق (ابھی تک) کسی شبہ میں ہو تو (سن لو کہ) اللہ کے سوا تم جن کی بندگی کرتے ہو میں ان کی بندگی نہیں کرتا بلکہ صرف اس خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے اختیار میں

تمہاری موت ہے (آیت ١٠٤) سورہ شعراء میں فرمایا اے نبی، اب اگر یہ لوگ تمہاری بات نہیں مانتے تو کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں بری الذمہ ہوں۔ (آیت ٢١٦) سورہ نساء میں فرمایا ”ان سے کہو جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی۔ کہو ہمارا رب (ایک وقت) ہمیں اور تمہیں جمع کرے گا اور ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا (آیت ٢٥، ٢٦) سورہ زمر میں فرمایا، ان سے کہوائے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ کام کئے جاؤ، میں اپنا کام کرتا رہوں گا۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسواء کن عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے جو ٹلنے والی نہیں (آیات ٣٩-٤٠) پھر یہی سبق مدینہ طیبہ میں تمام مسلمانوں کو دیا گیا کہ ”تم لوگوں کیلئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے، جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت ہوگئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ (الممتحنہ: ٤) قرآن مجید کی ان پے در پے توضیحات سے اس شبہ کی گنجائش تک نہیں رہتی کہ ”لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِىَ دِيْنِ“ کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے دین پر قائم رہو اور مجھے اپنے دین پر چلنے دو۔ بلکہ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسی سورۂ زمر میں فرمائی گئی ہے کہ ”اے نبی، ان سے کہو کہ میں تو اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اسی کی بندگی کروں گا، تم اسے چھوڑ کر جس جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو۔“ (آیت: ١٤)

صاحب تدبر القرآن کا بھی ایک نوٹ ملاحظہ کیجئے:

”لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِىَ دِيْنِ“ ...... ”یعنی جب میرے اور تمہارے دین میں کوئی اشتراک ماضی میں نہ ہوا، نہ حاضر میں ہے تو آئندہ کس طرح توقع کرتے ہو کہ ہم کسی ایک نقطہ پر مجتمع ہو سکیں گے۔ اس وجہ سے سمجھوتے کی توقع بالکل لا حاصل ہے۔ میرے لئے میرا دین ہے تمہارے لئے تمہارا دین۔ میں اپنے طریقہ پر کام کرتا ہوں اور تم اپنے طریقہ پر کام کرو اور دیکھو کہ انجام کار میری بات سچی ثابت ہوتی ہے یا تمہاری۔ یہی بات سورہ انعام میں یوں ارشاد ہوئی ہے۔ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ (الانعام: ١٣٥) (کہہ دو، اے قوم کے لوگو! ...... تم اپنی جگہ پر کام کرو، میں اپنی جگہ پر کام کرتا ہوں) سورہ ہود آیت ١٣٩ اور سورۂ زمر آیت ٣٩ میں بھی دوسرے رسولوں سے یہی کلمات نقل ہوئے ہیں اور مقصد اس سے صرف اس بحث وجدال کے دروازے کو بند کرنا ہے جو مخالفین اس مقصد سے کر رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے موقف کو بھی تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس اعلان سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو آخری آگاہی دے دی کہ نہ آپ اپنے دین سے ذرہ برابر ہٹنے کیلئے تیار ہیں اور نہ ہی ان کے دین کیلئے ہی کوئی مقام تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کو رواداری کے مفہوم میں لیا ہے۔

حالانکہ یہ کفار کے رویے سے بیزاری بلکہ انجام کار کے اعتبار سے ان سے ابدی مفارقت اور اعلان جنگ کے

مفہوم میں ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ وہی اعلان ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے سامنے کیا جس کا حوالہ قرآن مجید نے ان الفاظ میں دیا ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (الممتحنۃ:۴)

ترجمہ: تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ یاد کرو جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان چیزوں سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بالکل بری ہیں۔ ہم نے تمہارے عقیدے کا انکار کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت اور نفرت آشکار ہوگئی تا آنکہ تم اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ پر ایمان لاؤ۔''



وَلَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا



وَلَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ○ (ھود:۱۱۳)

ترجمہ: ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی وسرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔

اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا "اِسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ" یعنی جیسا کہ آپ کو حکم دیا جمے رہئے استقامت کو بقول حضرت حسن بصریؒ دو "لا" سے گھیر دیا گیا ہے۔ ایک "لَا تَطْغَوْا" حد سے تجاوز نہ کرو اور دوسرے "لَا تَرْکَنُوْا" نہ جھکنا۔ اس طرح استقامت کی راہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ غالباً اسی بناء پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا شیبتنی ھود۔ سورہ ھود نے مجھے بوڑھا بنا دیا۔

زیر بحث آیت میں ظالموں سے مراد وہ لوگ ہیں جو مکہ میں اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی میں مدہوش ہو رہے تھے۔ رات و دن جن سے مسلمانوں کی کشمکش برپا تھی وہ ہر قیمت پر اسلام کو نیچا دکھانے پر تلے ہوئے تھے۔ ان کی کشمکش اور مزاحمت کی غرض یہ تھی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے رویہ میں تھوڑی لچک پیدا کریں۔ اپنے موقف سے زیادہ نہیں تھوڑا تو ہٹیں ان سے محبت ومودت، ہمنوائی، ہم مشربی اور قدم سے قدم ملا کر چلنے کا سوال ہی کیا؟ حکم دیا گیا کہ ان ظالموں کی طرف ذرا جھکنا نہیں ورنہ انجام بہت برا ہوگا! اب موقع پر اسلوب کلام اور طرز تخاطب ایسا اختیار کیا گیا ہے جس کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ جیسے ایک پٹرول سے بھری ٹنکی ہے اور دوسری طرف ایک چنگاری ہے۔ ان دونوں میں نسبت یہ ہے کہ چنگاری قریب گئی کہ پٹرول بھڑک اٹھے گا ذرا دیر نہ لگے گی۔ ٹھیک اسی طرح ان ظالموں کی طرف جھکاؤ ہوتے ہی دوزخ کی آگ لپیٹ میں لے لے گی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جھکاؤ آخر کفر وشرک سے بھی اتنا زیادہ خطرناک کیوں بن جاتا ہے اس کا

جواب یہ ہے کہ کفر و شرک سنگین جرم ہیں لیکن کوئی شخص اپنے ہاتھ میں خدائی چراغ لئے ہوئے ہو اور پھر اندھیروں کے ٹھیکے داروں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھے۔ان کی طرف جھکاؤ رکھے تو اس کے کیا معنی ہیں! دراصل اس کے ڈانڈے منافقت سے جا ملتے ہیں۔ایک آدمی صرف اللہ کا نام لے اور دوسری طرف نمرود اور فرعون کے گن گائے۔ایک طرف رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس اور اسوہ کی بات کرے اور دوسری طرف ابوجہل اور ابولہب سے معانقہ بھی کرے۔ایک طرف غلبۂ دین اور اقامت دین کا بلند بانگ دعوی کرتا پھرے اور دوسری طرف سیکولرزم اور کمیونزم کا جھنڈا لے کر گلیوں میں دوڑے یہ صورتحال ایک معمولی اختیار و قوت والا شخص بھی اپنے دوستوں اور ساتھیوں کی نسبت سے پسند نہیں کر سکتا تو سلطان کائنات کیوں برداشت کرے گا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس جھکاؤ کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اس جھکاؤ میں کیا کیا چیزیں ہوتی ہیں؟؟

اس کا جواب صاحب جلالین کی مختصر تفسیر سے مل جاتا ہے:

"لَا تَرْكَنُوْٓا"، "تميلوا"، "اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا"۔ بمودة او مداهنة او برضا باعمالهم۔

ترجمہ: یعنی جھکاؤ کے معنی یہ ہیں کہ اہل باطل سے محبت کی جائے یا ان کے ساتھ مداہنت برتی جائے یا ان کی سرگرمیوں اور کرتوتوں پر رضا اور خوشی کا اظہار کیا جائے۔

افسوس ہے کہ آج اس جھکاؤ کو قطعاً سمجھا نہیں جا رہا ہے اور اس کے انجام کی پرواہ نہیں کی جا رہی ہے۔اس دور میں دنیا کے لوگ نہیں، کاروباری افراد نہیں، سیاست اور ڈپلومیسی کے اشخاص نہیں بلکہ دین کے لوگ علماء اور مشائخ، دینی انجمنوں اور دینی تنظیموں کے قائدین اور مرشدین، دعوت و تبلیغ کے مراکز کے ذمہ دار اصحاب کس طرح اہل باطل کی طرف محبت، مداہنت اور پھر ان کی مدح و ستائش کرتے ہوئے مسلسل جھکاؤ میں مبتلا ہیں۔ان کی پالیسی اور پروگرام کی مستقل بنیاد وقت کے فرعونوں اور طاغوتوں کی جانب میلان اور رکون پر رکھی جاتی ہے۔

علامہ فخر الدین رازیؒ اپنی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

"محققین کے نزدیک جس "رکون" یعنی جھکاؤ سے منع کیا گیا ہے اس میں ظالموں کی سرگرمیوں پر راضی ہونا، ان کے طرز عمل کی تحسین کرنا، انکی مجلس میں اور اس کے باہر اچھا بنا کر پیش کرنا اور ان کے کسی کام میں شریک ہونا۔البتہ کوئی فائدہ حاصل کرنے یا کسی ضرر سے بچنے کے لئے ان سے خلا ملا رکھنا جائز ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ کتنا نازک معاملہ ہے۔ظالموں کے کرتوتوں پر راضی رہنے کی گنجائش نہیں ہے بلکہ منکر پر نکیر کرنا اور اظہار ناپسندیدگی کرنا ایمان کی علامت ہے۔

ان کے طرز عمل کی تحسین یا تزئین کی بھی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ یہ بھی منکر کی تائید میں شامل ہو جائے گا اور ان کے کسی کام میں مشارکت کا بھی سوال نہیں کہ مشارکت فی العمل مشارکت فی الجزاء کا موجب ہوگا۔

اس مسئلہ کی اہمیت ونزاکت کا اندازہ یوں لگایئے کہ کسی موقع پر امام نے نماز میں یہ آیت تلاوت کی تو مصلیوں میں سے ایک بزرگ بے ہوش ہو گئے اور اس کے بعد فرمایا کہ یہ تو ظالم کی طرف ذرا جھکنے والے کا انجام ہے تو ظالم کا انجام کیا ہوگا۔ یا ان بزرگ کے قول کا منشاء یہ ہے کہ قرآن میں "اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا" استعمال ہوا "ظَالِمِيْنَ" نہیں۔ ظالم اور "اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا" میں فرق یہ ہے کہ "اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا" میں وہ لوگ شامل ہوں گے جن سے ظلم کا فعل کبھی سرزد ہو گیا اور "ظَالِمِيْنَ" سے مراد وہ ہیں جن کا شیوہ ہی ظلم کرنا ہو۔

امام زہریؒ نے جب بعض خلفاء سے ربط ضبط بڑھایا تو ان کے بعض مخلصین نے انہیں یہ خط لکھا:

''اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو فتنوں سے محفوظ رکھے۔ آپ اس وقت اس حال میں ہیں کہ آپ کے واقف کار آدمی کو چاہئے کہ آپ کے لئے اللہ سے دعا کرے کہ اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ آپ بوڑھے ہو چکے ہیں اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے کتاب وسنت کے علم کی شکل میں جو نعمت عطا فرمائی ہے اس نے آپ کو بوجھل کر دیا ہے۔ اللہ نے علماء سے میثاق لیا علم کو لوگوں کے سامنے بیان کرنے اور نہ چھپانے کا، آپ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ آپ نے اپنے طرز عمل سے ظالم کی وحشت کو انسیت سے بدل دیا ہے اور اپنی قربت سے بدی کی راہ کو آسان کر دیا ہے۔ یہ کم سے کم آپ کی خطاء ہے اس نے آپ کو ایک ایسا محور بنا دیا ہے جس کے اطراف باطل کی چکی گھوم رہی ہے۔ آپ کی حیثیت ایک پل اور سیڑھی کی بن چکی ہے جو ان کی گمراہیوں میں مددگار ہو رہی ہے۔ آپ کی وجہ سے علماء مشکوک ہو جا رہے ہیں اور جہلاء نمونہ بنتے جا رہے ہیں جو چیز آپ کا دین برباد کر کے آپ کو انہوں نے دی ہے وہ بہت ہی معمولی ہے۔ پس آپ اس آیت کے مصداق بن چکے ہیں۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ (مریم:۵۹)

ترجمہ: ''آپ اپنے دین کا علاج کیجئے۔ آپ کے دین کو روگ لگ چکا ہے اور طویل سفر کے لئے زادِ راہ کی فکر کیجئے اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ والسلام''

اس موقع پر سورہ بنی اسرائیل کی آیات (۷۳ تا ۷۵) سامنے رکھی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ جھکاؤ کیا چیز ہے اور اس جھکاؤ کے لئے اہل باطل کتنا زور لگا رہے ہیں۔ فریب، لالچ، دھمکی، پروپیگنڈہ، ظلم وستم، معاشی دباؤ اور معاشرتی قطع تعلقی کی شکل میں جو کچھ بھی کر سکتے ہیں وہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے ہیں۔ ٹھیک اس کے بالمقابل اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کی ایسی حفاظت وصیانت فرماتے ہیں کہ اہل باطل کی ہر چال ضائع ہو کر رہ جاتی ہے اور اللہ کے بندے ٹھیک راہ حق پر جمے رہتے ہیں۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ○ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ○ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ○ (بنی اسرائیل: ۷۳)

ترجمہ: اے محمد! ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تا کہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گڑھو اگر تم ایسا کرتے تو وہ ضرور تمہیں اپنا دوست بنا لیتے اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔ لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا، پھر ہمارے مقابلہ میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔

معلوم ہوا کہ اللہ کی نصرت اور حفاظت کا راستہ یہ ہے کہ آدمی ٹھیک ٹھیک اس لائن پر جما رہے جو اللہ اور اس کے رسول نے کھینچ دی ہے اور دنیا کی ساری کامیابیوں اور ناکامیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے صحیح خطوط پر اپنی تگ و دو جاری رکھے۔ دنیا میں کامیاب ہونا یا دنیا والوں کی نظر میں ہماری امیج کا اچھا ہونا، ہماری دعوت کا مقبول ہو جانا کوئی اہم بات نہیں۔ اہم بات صرف یہ ہے کہ ہم کہاں تک اس پوائنٹ اور نکتہ کو پکڑے ہوئے ہیں جو کتاب و سنت نے ہمیں دیا ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اپنی معرکۃ الآرا تفسیر ''معارف القرآن'' میں رقمطراز ہیں۔

''دوسری آیت میں انسان کو خرابی اور بربادی سے بچانے کے لئے ایک اور اہم ہدایت نامہ دیا گیا ہے۔ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ یعنی ظالموں کی طرف ادنیٰ میلان بھی نہ رکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے ساتھ تمہیں بھی جہنم کی آگ لگ جائے۔ لاترکنوا مصدر رکون سے بنا ہے جس کے معنی کسی طرف خفیف سے میلان اور جھکاؤ اور اس پر اعتماد و رضا کے ہیں۔ اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ ظلم و جور میں خود مبتلا ہونے کو تو دین و دنیا کی تباہی سبھی جانتے ہیں مگر ظالموں کی طرف ادنیٰ سا جھکاؤ اور میلان ان سے راضی ہونا، ان پر اعتماد کرنا بھی انسان کو اسی بربادی کے کنارے لگا دیتا ہے۔ اس جھکاؤ اور میلان سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق صحابہ و تابعین کے چند اقوال منقول ہیں جن میں کوئی تعارض و اختلاف نہیں سب اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں:

حضرت قتادہؓ نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ ظالموں سے دوستی نہ کرو ان کا کہنا نہ مانو۔ ابن جریجؒ نے فرمایا کہ ظالموں کی طرف کسی طرح کا بھی میلان نہ رکھو۔ ابو العالیہؒ نے فرمایا کہ ان کے اعمال و افعال کو

پسند نہ کرو (قرطبی)۔ سدیؒ نے فرمایا کہ ظالموں سے مداہنت نہ کرو۔ یعنی ان کے برے اعمال پر سکون یا رضا کا اظہار نہ کرو۔ عکرمہؒ نے فرمایا کہ ظالموں کی صحبت میں نہ بیٹھو۔ قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ شکل وصورت اور فیشن اور رہن سہن کے طریقوں میں ان کا اتباع کرنا یہ سب اسی ممانعت میں داخل ہے۔

قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ ظلم و جور کی ممانعت اور حرمت کے لئے اس آیت میں وہ انتہائی شدت ہے جو زیادہ سے زیادہ تصور میں لائی جاسکتی ہے کیونکہ ظالموں کے ساتھ دوستی اور گہرے تعلق ہی کو نہیں بلکہ ان کی طرف ادنیٰ درجہ کا میلان اور جھکاؤ اور ان کے پاس بیٹھنے کو بھی اس میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

امام اوزاعیؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی شخص اس عالم سے زیادہ مبغوض نہیں جو اپنے دنیاوی مفاد کی خاطر کسی ظالم سے ملنے کے لئے جائے (مظہری) تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہل کفر اور اہل معصیت اور اہل بدعت کی صحبت سے اجتناب اور پرہیز واجب ہے بجز اس کے کہ کسی مجبوری سے ان سے ملنا پڑے اور حقیقت یہی ہے کہ انسان کی اصلاح وفساد میں سب سے بڑا دخل صحبت اور ماحول کا ہوتا ہے، اسی لئے حضرت حسن بصریؒ نے ان دونوں آیتوں کے دو لفظوں کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے دین کو دو حرف لا کے اندر جمع کر دیا ہے ایک پہلی آیت میں "لَا تَطْغَوْا" اور دوسری آیت میں "لَا تَرْكَنُوْا" پہلے لفظ میں حدود شرعیہ سے نکلنے کی اور دوسرے لفظ میں برے لوگوں کی صحبت کی ممانعت ہے اور یہی سارے دین کا خلاصہ ہے۔"



وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَھُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی



وَلَن تَرْضٰی عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِن وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ○ (البقرۃ:۱۲۰)

ترجمہ: یہود اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو، صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے ورنہ اگر اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لئے نہیں ہے۔

اس آیت سے تین باتیں خاص طور سے معلوم ہوتی ہیں:

① یہود و نصاریٰ مسلمانوں سے کبھی خوش نہیں ہو سکتے ہیں۔

② ہدایت صرف اللہ کی ہدایت ہے دوسرے تمام مذاہب، عقائد اور نظریات خواہشات نفس پر مبنی ہیں۔

③ لوگوں کی خواہشات کی پیروی اگر مسلمان کریں گے تو ان کا حامی و مددگار کوئی نہ ہوگا اور وہ بے سہارا ہو کر رہ جائیں گے۔

یہ تینوں باتیں دائمی اُصول کے طور پر بیان کی گئی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ نزول وحی کے زمانہ یا دور اول تک کے لئے خاص تھیں اور آئندہ وقت اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ یہ تبدیل ہو سکتی ہیں۔

یہ ہدایات جس خاص پس منظر میں دی گئی ہیں، وہ پس منظر بھی گویا آئندہ کسی وقت بھی آسکتا ہے۔ انسانی نفسیات ہمیشہ ایک ہی رہی ہیں اور آئندہ رہیں گی جن انسانی نفسیات کے تناظر میں یہ باتیں کہی گئی ہیں وہ نفسیات آج بھی ظاہر ہورہی ہیں۔ اس لئے آج بھی مسلمان ان اُصولی ہدایت کا محتاج ہے۔

جیسا کہ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا دونوں میں یہ خبریں آچکی ہیں کہ کئی مسلم ممالک میں اسکولی نصاب سے وہ آیات قرآنی نکالی جارہی ہیں جن میں یہود و نصاریٰ پر کوئی تنقید کی گئی ہے۔ اسی طرح جہادی احکام پر مشتمل حصوں کو بھی حذف کیا جارہا ہے۔ اس طرح کا عمل مغرب ''یہود و نصاریٰ'' کی ناراضگی سے بچنے اور ان کو خوش رکھنے کے لئے کیا جارہا ہے لیکن قرآن کی حقانیت کا یہ ثبوت ہے کہ یہود و نصاریٰ کو خوش کرنے میں مسلم ممالک مسلسل ناکام ہورہے ہیں اور خوش ہونے اور راضی ہونے کے لئے قطعاً وہ تیار نہیں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک خوش ہونے کا جو معیار ہے اس پر ابھی مسلمان پورے نہیں اتر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جو مسلمان مغربی تہذیب میں بالکل ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کے دلوں میں بھی توحید کی چنگاریاں دبی پڑی ہیں جو کبھی بھی بھڑک سکتی ہیں۔

مغرب کو راضی کرنے کی یہ کوشش عموماً مادی مفاد کے تحت کی جارہی ہے۔ لیکن دعوتی مفاد کے نام پر بھی کی جاتی ہیں اور قرآنی حقائق اور ہدایات کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ واعظین اور خطیب حضرات اسی طرح کے مصالح کے پیش نظر لفظ جہاد کی جگہ عام طور پر جدوجہد کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ تاکہ سامنے والوں کی نظر عتاب سے بچے رہیں اور جہادی گروپ کی ہمنوائی کے الزام سے محفوظ رہیں۔ حالانکہ جہاد ایک قرآنی اور دینی اصطلاح ہے صلوٰۃ، زکوٰۃ اور صیام کی طرح۔ ان کی تشریح میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ان اصطلاحوں سے گریز کرنا بے دینی کی بات ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ جس طرح دعوت ہمارا ایک فریضہ ہے اسی طرح یہ بھی ہمارا فریضہ ہے کہ ہم کوشش کرتے رہیں کہ دعوتی مشن کو کوئی صدمہ نہ پہنچے اور احتیاط ہمارے لئے لازم رہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کسی مسلمان کی مدد اس خیال سے نہ کی جائے کہ ہمارے مدعوئین پر بُرا اثر پڑے گا یا کسی مسلم خاتون کی عصمت ریزی پر خاموشی اختیار کرلی جائے تاکہ ہمارے مدعوئین ناراض نہ ہوجائیں۔ یا شعائر اللہ کی بے حرمتی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور چوں نہ کریں تاکہ دعوت کے مواقع باقی رہیں اس کے لئے کتاب وسنت سے دلیل لانی پڑے گی ایسا تو نہیں کہ دعوتی مشن کو صدمہ سے بچانے کا نکتہ اپنے اوپر عائد ہونے والے فرائض کو ادا نہ کرنے کے لئے بہانہ ہے جو شیطان نے ہمیں سجھایا ہے اور اپنی بزدلی اور بے غیرتی

پر پردہ ڈالنے کے لئے ایک شیطانی وسوسہ ہے۔ یہ وسوسہ کوئی نیا وسوسہ نہیں ہے اور دورِ اول میں بھی کچھ لوگوں کے اندر پیدا ہو رہا تھا غالباً اسی بناء پر مسلمانوں کو پوری طرح یکسو کر دیا گیا اور یہ صاف صاف بتا دیا گیا کہ اعداءِ دین تم سے کبھی خوش اور راضی نہیں ہو سکتے اور نہ اپنی ریشہ دوانیوں سے باز آ سکتے ہیں۔

وَلَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (البقرۃ:۲۱۷)

ترجمہ: وہ برابر تم سے جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں اگر ان کا بس چلے۔

دشمنانِ اسلام کو راضی اور مطمئن رکھنے کی کوشش کرنے کی تعلیم اور ہدایت ہمیں کہیں نہیں ملتی بلکہ جو تعلیم دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ تم اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو ادا کر دو، حدود اللہ سے تجاوز نہ کرو، حالات جو کچھ بھی ہوں ہر حالت میں تقویٰ کی روش اختیار کرو، اللہ کے ذکر سے غافل نہ رہو، راہِ راست پر کسی کو لانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے تمہاری ذمہ داری بس یہ ہے کہ تم اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر حسن سلوک کرنے والا اور صبر کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نرم روی اور خوش اخلاقی دعوت کے مواقع کو محفوظ نہ رکھ سکی یہاں تک کہ بالآخر آپ کو مکہ چھوڑنا پڑا۔ مدینہ تشریف لائے پھر جنگوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مدعوئین کی کسی حرکت کی اطلاع ملتے ہی کوئی نہ کوئی دستہ متحرک ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں سوچا جاتا کہ خاموش بیٹھو ورنہ تمہارے مدعوئین بدظن ہو جائیں گے اور دعوتی مشن کو صدمہ پہنچ جائیگا۔

رجب ۲ ہجری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آٹھ آدمیوں کا ایک دستہ مکہ اور طائف کے علاقے میں مدعوئین کی نقل وحرکت اور ان کے عزائم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے روانہ فرمایا تھا۔ اس دستہ کو قریش کا ایک تجارتی قافلہ مل گیا اس کو انہوں نے پکڑ لیا ان میں سے ایک کو قتل کر دیا اور بقیہ کو گرفتار کر کے مدینہ لائے۔ یہ واقعہ رجب کے آخر میں یا شعبان کے شروع میں پیش آیا۔ مدعوئین نے پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ مسلمان ماہِ حرام کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ اس موقعہ پر سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۷ نازل ہوئی جس میں مدعوئین کے طرزِ عمل پر نکیر کی گئی کہ تم کس منہ سے مسلمانوں کے خلاف بول رہے ہو۔ ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ اور مسلمانوں سے کہا کہ تم سادہ لوحی سے کام نہ لو اور ان کے اعتراضات سے متاثر نہ ہو یہ تو ہمیشہ اسی کوشش میں رہیں گے کہ کسی نہ کسی طریقہ سے تمہیں راہ راست سے بھٹکا دیں۔ مسلمانوں سے یہ نہیں کہا گیا کہ تم اپنے ہاتھوں دعوت کے مواقع کیوں ضائع کر رہے ہو۔

شوال ۲ ہجری کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک یہودی نے ایک مسلمان انصار یہ عورت کی بے حرمتی کی تو ایک مسلمان نے اس یہودی کو مار ڈالا۔ یہودیوں نے اس مسلمان کو قتل کر دیا۔ اس معاملہ نے طول پکڑا مسلمانوں نے یہودیوں کے قلعہ کا پندرہ دن تک محاصرہ کئے رکھا۔ پھر پورے قبیلہ کو جلاوطن کر دیا گیا۔

قرآن میں مسلمانوں کو جو ہدایات دی گئی ہیں وہ اس طرح کی ہیں۔

مسلمانو!

تم دشمنانِ اسلام کے مقابلہ میں کمزور نہ پڑ جاؤ۔ وہ اپنے لئے نرمی کے بجائے تمہارے اندر سختی پائیں تم ان کی طرف نہ جھکو۔ ہوشیار رہو تم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس کی وجہ سے تمہاری ہوا اکھڑ جائے۔ تم ان پر رعب ڈالنے کی کوشش میں رہو۔

الغرض مدعوئین کو مسلمانوں کے بارے میں خوش گمان رکھنے کی کوشش میں نہ تو غیرت اور ایمانی تقاضے کو پورا کرنے سے رکنے کی تعلیم دی گئی اور نہ اپنے کو سیدھا سادہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہدایت دی گئی ہے بلکہ سخت بن کر رہنے کی بات کہی گئی تا کہ ان کی جرأتیں نہ بڑھ جائیں۔



فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا



وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۞ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞ (البقرۃ:۱۰۹)

ترجمہ: اہل کتاب میں اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں، اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے، اپنے نفس کے حسد کی بناء پر۔ اس کے جواب میں تم عفو و درگذر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ خود ہی اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔ مطمئن رہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اس آیت میں اہل کتاب کی ایک پُر فریب چال اور مکر کو دفع کرنے کے ضمن میں مسلمانوں کو معاف اور درگزر کرنے کا حکم دیا گیا۔ اسی طرح قرآن کے متعدد مقامات پر معاف کرنے اور درگزر کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اللہ کے نیک بندوں کی صفت بھی بتائی گئی ہے کہ وہ غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ اعراض کرنا، درگزر کرنا، معاف کر دینا اس میں شک نہیں کہ ایک اعلیٰ اور بہترین صفت ہے۔ لیکن اس کی ایک حد ہے اور اس کے کچھ مواقع ہیں۔ لیکن حالات کے دباؤ اور موجودہ صورتحال کے تناظر میں اعراض اور درگزر کرنے کی نسبت دین اسلام کے تئیں اس طرح کی جاتی ہے کہ اصل حقیقت پر پردہ پڑ جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام عیسائیت سے بڑھ کر عفو و درگزر کا حکم دیتا ہے اور اسلام کی تصویر بگڑ کر رہ جاتی ہے۔ سختی اور نرمی کا جو معتدل اور متوازن نظام اسلام رکھتا ہے اس کی صورت مسخ کر دی جاتی ہے۔

اب دیکھئے قرآن کیا کہتا ہے:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۞ (البقرۃ:۱۹۰)

ترجمہ: اور جنگ کرو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ○ (البقرۃ:۱۹۴)

ترجمہ: پس تم پر جو دست درازی کرے تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو اور جان لو اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِکِیْنَ کَآفَّۃً کَمَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ کَآفَّۃً. (التوبۃ:۳۶)

ترجمہ: اور مشرکوں سے تم سب مل کر لڑو جیسا کہ وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَی الْاَرْضِ (التوبۃ:۳۸)

ترجمہ: اے ایمان والو تمہیں کیا ہو گیا ہے جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کیلئے کہا گیا تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْکُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا وَّیَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ (التوبۃ:۳۹)

ترجمہ: اگر تم نہ نکلو گے تو خدا تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہارے علاوہ کسی دوسری قوم کو لا دے گا۔

وَمَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ الظَّالِمِ اَھْلُھَا.
(النساء: ۷۵)

ترجمہ: اور تمہیں کیا ہو گیا کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے کس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کمزور پا کر دبا دیئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں۔

ان آیات میں جنگ کا حکم بھی ہے اور ترغیب بھی۔ نیز جنگ سے جی چرانے والوں کی سرزنش کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ قرآن میں جنگ میں جان کی بازی لگانے والوں کے لئے مغفرت کی اور جنت کی اور فتح و کامرانی کی خوشخبری دی گئی ہے۔ جنگ میں مرنے والوں کو مردہ کہنے سے منع کیا گیا ان ہی کو حقیقی زندگی حاصل ہے بتایا گیا۔ جہاد و قتال کو فرض بتایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ بظاہر ناپسندیدہ ہے لیکن حقیقت میں وہ تمہارے لئے باعث

خیر ہے۔ جنگ میں مرنے والوں کے درجات علیا اور اجر و ثواب کا ذکر جس انداز میں اور جس کثرت سے کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں ہے۔ ان باتوں کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے کہ تشدد کا جواب طاقت سے دینے کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے؟ یہ بات بالکل ایسی ہے کہ کوئی دانشور بھری مجلس میں پورے زور سے کہے کہ قرآن میں جہاد و قتال کا لفظ نہیں آیا ہے اور جنگ بدر و حنین اور جنگ اُحد اور خندق نام کا کوئی معرکہ کبھی پیش نہیں آیا ہے۔ اسلام سراسر امن و سلامتی کا مذہب ہے مگر جہاد و قتال سے متعلق درجنوں آیات قرآنی، سینکڑوں فقہی اوراق کتب اور ہزاروں صفحات پر مشتمل اسلامی تاریخ کو نظر انداز کرنا کیونکر ممکن ہوسکتا ہے۔

سورہ شوریٰ کی ۳۹ نمبر آیت پر پہلے مولانا مودودیؒ کا نوٹ پڑھئے:

''یہ بھی اہل ایمان کی بہترین صفات سے ہے وہ ظالموں اور جباروں کیلئے نرم چارہ نہیں ہوتے ان کی نرم خوئی اور عفو و درگذر کی عادت کمزوری کی بناء پر نہیں ہوتی۔ انہیں بھکشوؤں اور راہبوں کی طرح مسکین بن کر رہنا نہیں سکھایا گیا ہے۔ ان کی شرافت کا تقاضہ یہ ہے کہ جب غالب ہوں تو مغلوب کے قصور معاف کردیں۔ جب قادر ہوں تو بدلہ لینے سے درگزر کریں اور کسی زیردست یا کمزور آدمی سے کوئی خطا سرزد ہوجائے تو اس سے چشم پوشی کرجائیں لیکن جب کوئی طاقتور اپنی طاقت کے زعم میں ان پر دست درازی کرے تو ڈٹ کر کھڑے ہوجائیں اور اس کے دانت کھٹے کردیں۔ مومن کبھی ظالم سے نہیں دبتا اور منکر کے آگے نہیں جھکتا۔ اس قسم کے لوگوں کے لئے وہ لوہے کا چنا ہوتا ہے جسے چبانے کی کوشش کرنے والا اپنا ہی جبڑا توڑ لے گا۔''

سورۂ شوریٰ آیت ۳۹ کے سیاق وسباق میں ایک تفسیری اشکال

غور طلب بات یہ ہے کہ ایک جگہ ''هُمْ يَغْفِرُوْنَ'' یعنی وہ معاف کرتے ہیں۔ دوسری جگہ ''اِذَاۤ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ'' یعنی جب ان کے ساتھ زیادتی کی جاتی ہے تو وہ مقابلہ کرتے ہیں۔ تیسری جگہ ''فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ'' کہا گیا۔ یعنی پس جو معاف کرے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ پر ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان باتوں میں باہمی ربط اور تعلق کیا ہے؟ بظاہر دو متضاد صفتوں کا حامل مسلمانوں کو بتایا ہے۔

ایک طرف کہا جارہا ہے کہ مسلمانوں کے اندر معاف کرنے کی صفت پائی جاتی ہے۔

دوسری طرف یہ بھی کہا جارہا ہے کہ وہ مقابلہ کرتے ہیں اور انتقام لیتے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟
اس اشکال کو مختلف مفسرین نے رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔

صاحب روح المعانیؒ کا جواب

صاحب روح المعانیؒ نے کہا:

''کئی لوگوں نے کہا ہے کہ ہر صفت کے ظاہر ہونے کا ایک موقع ہے جس میں وہ قابل تعریف ہوتی ہے پس درگزر کی صفت اس وقت قابل تعریف اور محمود ہے جب معافی اور درگزر ایسے شخص سے کیا جائے جو کمزور ہو اور اسے اپنے جرم کا اعتراف ہو۔ لفظ یَغْفِرُوْنَ سے اس کی طرف اشارہ ہورہا ہے اور انتقام اور مقابلہ اس وقت محمود ہوتا ہے جب سامنے والا دشمنی اور مخاصمت پر اصرار کررہا ہو اور لفظ یَنْتَصِرُوْنَ اس کی طرف اشارہ کررہا ہے۔ اگر اس کے برعکس درگزر اور انتقام کا عمل کیا جائے تو دونوں مذموم ہیں۔ اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے علامہ نے عربی کے دو شعر پیش کئے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب تم کسی شریف کی عزت کرو گے تو وہ تمہارا گرویدہ ہوجائے گا اور جب کسی کمینہ کے ساتھ اکرام کرو گے تو وہ اپنی کمینگی میں اور بڑھ جائے گا۔ تلوار کی جگہ شبنم اور شبنم کی جگہ تلوار رکھنا مضر ہے۔''

امام رازیؒ کا جواب

امام رازیؒ نے اس شبہ کو یوں دور کیا ہے:

''عفو و درگزر کی دو قسمیں ہیں ایک عفو درگزر وہ ہے جس سے فتنہ دب جائے اور جو مجرم کے لئے سزا ثابت ہو اور وہ اپنے جرم سے باز آجائے۔ دوسرا عفو و درگزر وہ ہے جس سے مجرم کی جرأت میں اضافہ ہوجائے اور اس کے غیظ و غضب کو شہ ملے۔ عفو و درگزر سے متعلق آیات میں پہلی قسم کے درگزر کی تعریف کی گئی اور اس کو مسلمانوں کی صفت بتائی گئی ہے اور جہاں عفو و درگزر سے جرم پر جرأت بڑھ جانے کا امکان ہو وہاں عفو و درگزر کے بجائے مومنانہ صفت انتقام لینے کو بتایا گیا ہے۔''

مفتی شفیع صاحبؒ کا جواب

اس کی مزید وضاحت کے لئے تفسیر معارف القرآن کے یہ الفاظ پڑھیئے:

''حضرت ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا کہ سلف صالحین یہ پسند نہ کرتے تھے کہ مومنین اپنے آپ کو فساق و فجار کے سامنے ذلیل کریں اور ان کی جرأت بڑھ جائے۔ اس لئے جہاں یہ خطرہ ہو کہ معاف کرنے سے فساق و فجار کی جرأت بڑھے گی وہ اور نیک لوگوں کو ستائیں گے وہاں انتقام لے لینا بہتر ہوگا۔ اور معافی کا افضل ہونا اس

صورت میں ہے جبکہ ظلم کرنے والا اپنے فعل پر نادم ہو اور ظلم پر اس کی جرأت بڑھ جانے کا خطرہ نہ ہو۔ قاضی ابو بکر ابن عربی نے احکام القرآن میں اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے کہ عفو و انتقام کے دونوں حکم مختلف حالات کے اعتبار سے ہیں جو ظلم کرنے کے بعد شرمندہ ہو جائے اس سے عفو افضل ہے اور جو اپنی ضد اور ظلم پر اصرار کر رہا ہو اس سے انتقام لینا افضل ہے۔''

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا جواب

مولانا امین احسن اصلاحیؒ صاحب نے آیت ﴿۴۱﴾ کے فقرہ "وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ" پر مندرجہ ذیل نوٹ لکھا ہے:

''یہ ان لوگوں کے شبہ کا جواب ہے جو دینداری کا ایک تقاضہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ آدمی دوسروں کے ہاتھوں پٹتا رہے اور ان سے کوئی انتقام نہ لے اگر کوئی انتقام لے تو یہ چیز دینداری کے خلاف سمجھی جاتی ہے اور اس کو بھی برابر کا مجرم سمجھ لیا جاتا ہے۔

فرمایا کہ اس طرح کے معاملات میں الزام ان لوگوں پر نہیں ہے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کئے جانے کے بعد انتقام لیا بلکہ الزام ان لوگوں پر ہے جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور بلا کسی استحقاق کے خدا کی زمین پر سرکشی اور طغیان کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

دوسرا اشکال

اس موقع پر بعض لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے ہابیل کے رویہ کو بھی پیش کرتے ہیں جس نے قابیل سے کہا تھا تم اگرچہ کہ مجھے قتل کرنا چاہتے ہو لیکن میں تمہیں قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِىَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ۔

یہاں بھی ایک اشکال ہے اشکال کی وجہ یہ ہے کہ شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دفاع کی وہ حیثیت نہیں ہے جو شریعت عیسوی میں تھی۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے جو تمہارے ایک گال پر مارے اُسے تم اپنا دوسرا گال بھی پیش کر دو۔

اس کے برخلاف حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک آدمی آیا اور کہا۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کا کیا خیال ہے ایک شخص آتا ہے اور میرا مال چھین لیتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم اس کو اپنا مال نہ دو۔ پھر اس آدمی نے کہا اگر وہ مجھ سے جنگ کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ تم اس سے جنگ کرو۔

اس آدمی نے کہا۔ آپ کا کیا خیال ہے اگر وہ مجھے قتل کر دے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم شہید ہو گئے۔
پھر اس آدمی نے پوچھا آپ کا کیا خیال ہے اگر میں اس کو قتل کر دوں۔
آپ نے فرمایا وہ دوزخ میں جائے گا۔ (الجنایات۔مشکوۃ)

مشہور حدیث

من قتل دون ماله و عرضه فهو شهيد

ترجمہ: جو اپنے مال اور عزت کو بچانے میں مارا گیا وہ شہید ہے۔

دفاع کے سلسلہ میں اس طرح کی تعلیم کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہابیل نے کیوں کہا کہ میں تمہیں قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہ اُٹھاؤں گا۔

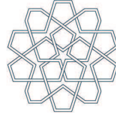
اس کا **ایک** جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ ہابیل کی بات وعظ اور نصیحت پر محمول کی جائے کہ اس طرح کی بات سن کر قابیل کو کچھ تو احساس ہوگا کہ مجھے اپنے مخلص بھائی پر ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہیئے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ بہ نیت قتل ہاتھ نہ اُٹھانے کی بات ہابیل نے کہی تھی۔ مطلق دفاع نہ کرنے کی بات نہیں تھی۔

ایک **تیسرا** جواب حضرت مجاہدؒ نے دیا ہے کہ ممکن ہے اس وقت کی شریعت میں دفاع جائز نہ رہا ہو۔



وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ



وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِأَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ○ (البقرہ:۱۹۵)

ترجمہ: اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور احسان کرو بلا شبہ اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ (تفہیم القرآن)

اس آیت سے پہلے جنگ کا حکم دیا گیا اس کے بعد اس آیت میں خرچ کرنے کا حکم ہے۔ جنگ میں جان کے ساتھ ساتھ مال کی بھی ضرورت ہوتی ہے رسد اور اسلحہ کے بغیر کامیاب جنگ نہیں کی جا سکتی اور بسا اوقات لڑنے والے کے پاس مال نہیں ہوتا کہ سامانِ حرب مہیا کرے اور اپنے بال بچوں کے لئے کسب معاش کی فکر سے آزاد ہو کر میدان میں جائے۔ اس لئے جنگ کے حکم کے معاً بعد انفاق کرنے کا حکم آیا ہے اور ہوسکتا ہے کہ یہ حکمت بھی ہو کہ جو لوگ جسمانی اعتبار سے میدان میں نہیں جا سکتے ان کے لئے جہاد میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کا موقع نکالا جائے۔ "فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" کی قید لگائی گئی اس میں جہاں ترغیب کا پہلو ہے کہ ''تمہارا انفاق اللہ کے لئے ہوگا اللہ اس کا بدلہ دے گا تمہارا مال ضائع نہیں ہوگا'' وہیں یہ پہلو بھی ہے کہ ''جو بھی خرچ کرو اللہ کے واسطے ہی خرچ کرو۔''

انفاق کا حکم مثبت طریقہ پر دینے کے بعد اسی بات کو مزید مؤکد کرنے کے لئے منفی انداز میں کہا گیا کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو جیسے کسی کو کہا جائے: ''بازار میں جا کر کاروبار کرو گھر میں بیٹھ کر اپنے پیر پر کلہاڑی نہ مارو۔''

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ -کا ایک ترجمہ آپ کے سامنے ہے۔ دو ترجمے اور ملاحظہ کیجئے:

''اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو''۔ (احسن التفاسیر)

''اپنے آپ کو تباہی میں نہ جھونکو''۔ (تدبر قرآن)

ان تین ترجموں میں سے کسی کو غلط نہیں قرار دیا جا سکتا لیکن سوچنے کے لئے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ''نہ ڈالو'' کی جگہ ''نہ پڑو'' کیسے ترجمہ کیا گیا اور پہلے ترجمہ میں ''اپنے آپ کو'' کا لفظ کس لفظ کا ترجمہ ہے اور تیسرے ترجمہ میں ''نہ جھونکو'' کے الفاظ کیسے آئے؟ درحقیقت اس فقرہ میں زبان و بیان کی ایک خاص نزاکت ہے جس کو نمایاں کرنے کی اردو مترجمین نے کوشش کی ہے۔ بالکل لفظی ترجمہ یہ ہے۔ ''مت ڈالو ہاتھوں اپنے کو طرف ہلاکت کے۔''

ایک امکان یہ بھی ہے کہ ''لَا تُلْقُوْا'' سے منفی انداز میں جو بات کہی گئی ہے اس کا تعلق صرف انفاق سے ہو اور دوسرا امکان کہ انفاق اور قتال دونوں سے ہو۔ ہمارے خیال میں اس کو کسی سے بھی جوڑا جائے مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں ہوگا۔ علامہ آلوسیؒ نے اپنی تفسیر روح المعانی میں اس موقع پر جو کچھ لکھا اس کا ماحصل یہ ہے۔

''اس کا تعلق جنگ اور انفاق دونوں سے ہے مطلب یہ ہے کہ جنگ اور انفاق کو چھوڑ دینا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دینے کے برابر ہے گویا پہلی ہی بات تاکید کے لئے منفی انداز میں کہی گئی ہے۔ اس مفہوم کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس کو ایک سے زیادہ راویوں نے ابوعمران سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ ''ہم قسطنطنیہ میں تھے رومیوں کا ایک فوجی دستہ سامنے آیا اس وقت مسلمانوں میں سے ایک شخص نکلا اور اس فوجی دستہ میں گھس گیا، لوگ چیخ پڑے ''القی بیدہ الی التھلکۃ'' یعنی اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ اس موقع پر حضرت ابو ایوب انصاریؓ کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔ لوگو! تم اس آیت کے یہ معنی کر رہے ہو جو صحیح نہیں ہے۔ یہ آیت ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اللہ جل شانہ نے جب اسلام کو عزت بخش دی اور حامیان دین کی کثرت ہو گئی تو ہم میں سے بعض لوگوں نے آپس میں چپکے چپکے کہنا شروع کیا۔ ہمارے اموال ضائع ہو گئے۔ اب اسلام کو اللہ نے عزت دے دی ہے اور دین کے انصار و مددگار بہت ہو گئے ہیں اب ہم اپنی جگہ ٹھہر کر اپنے پچھلے نقصانات کی تلافی کر لیں۔ یہ آیت دراصل ہمارے اس خیال کی تردید میں نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتایا گیا کہ تمہاری سوچ صحیح نہیں ہے جہاد کو چھوڑ دینا اور اپنے مال و دولت میں بڑھوتری کے لئے اپنی جگہ بیٹھے رہنا انتہائی تباہ کن ہوگا اور اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں ہلاکت کے الاوے میں جھونک دینے کے ہم معنی ہوگا۔''

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں براء بن عازبؓ کی ایک تفسیر نقل کی ہے:

''وہ یہ کہ ہلاکت میں ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں کسی فائدے کی توقع نہیں ہے وہاں جنگ کر کے اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔ البتہ فائدہ میں دشمن کو نقصان پہنچانا بھی شامل ہے۔ یعنی کم از کم دشمن کو نقصان پہنچانے کی توقع جنگ میں شامل ہونے کے لئے ضروری ہے۔ جہاں اور جب دشمن کو کوئی نقصان اور زخم پہنچانے کی امید نہ ہو، وہاں اور اس وقت جنگ سے اپنے آپ کو بچانے کا حکم دیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں جس جنگ سے دشمن کو نقصان پہنچنے کی امید ہو اس جنگ سے روکا نہیں گیا اور اس جنگ کو بے فائدہ نہیں کہا جائیگا۔

کچھ دوسرے لوگوں نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی تفسیر پر حرف زنی کی ہے اور اپنی دلیل میں ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کی ہے۔ ایک اور روایت حضرت شافعیؒ کی ہے کہ ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقع پر جنت کا ذکر فرمایا۔ جنت کا حال سن کر ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا اگر میں ثواب کی نیت کروں اور صبر کروں اور اسی حالت میں قتل کر دیا جاؤں تو کیا ہوگا'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم جنت میں جاؤ گے یہ سن کر وہ دشمنوں میں گھس گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے شہید کر دیئے گئے۔

ایک اور صحابی زرہ پہنے ہوئے تھے انہوں نے اپنی زرہ پھینک دی اور دشمنوں میں گھس گئے اور شہید کر دیئے گئے۔ ایک انصاری صحابی جو عین موقع پر موجود نہیں تھے پیچھے رہ گئے تھے آئے انہوں نے دیکھا کہ شہداء کی لاشوں پر چڑیاں منڈلا رہی ہیں یہ دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا جہاں میرے ساتھی قتل کئے گئے ہیں میں وہاں جائے بغیر نہیں رکوں گا چنانچہ وہ وہاں گئے اور وہ بھی شہید کر دیئے گئے۔ اس واقعہ کا تذکرہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ تحسین فرمائی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ کچھ لوگوں نے ایک قلعہ کا محاصرہ کر رکھا تھا ان میں سے ایک شخص تنہا آگے بڑھا اور لڑنے لگا اور شہید کر دیا گیا۔ یہ دیکھ کر کچھ لوگ بول پڑے ''القی بیدہ الی التھلکۃ'' اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی یہ بات سنی اور فرمایا: لوگوں نے جھوٹ کہا۔ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ۔ لوگوں میں سے بعض اپنی جان قربان کر دیتے ہیں اللہ کی رضا جوئی میں۔ (البقرۃ: ۲۰۷)''

علامہ آلوسیؒ اور علامہ فخر الدین رازیؒ کی جو گفتگو ہم نے اوپر نقل کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہادت کا حصول بذات خود ایسی چیز ہے جس کو مقصود و مطلوب بنایا جانا قرآن کی روشنی میں صحیح قرار پاتا ہے اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کے اس منشاء کو ٹھیک سمجھا اور اپنی عملی زندگی میں اس کی عملی تصویر بنا کر دکھا دی اور کسی بھی نفع و نقصان کی پرواہ کئے بغیر جام شہادت نوش فرماتے رہے۔

اس مفہوم کو علامہ اقبال نے نہایت ہی مختصر لفظوں میں یوں واضح فرمایا ہے:

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن

نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

شہادت مومن کا مقصود و مطلوب ہے ہی، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ اللہ کے یہاں بھی جیسے وہ ایک شئ مقصود و مطلوب ہو۔ چنانچہ سورۂ آل عمران آیت ۱۴۰ پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ جب کبھی کفار کو مسلمانوں پر غلبہ دیتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کا پلڑا اینچا کرتے ہیں تو اس میں دیگر بہت ساری حکمتوں اور مصلحتوں کے ساتھ ایک مصلحت یہ ہوتی ہے کہ کچھ مسلمانوں کو شہادت کی عزت اور سعادت سے ہمکنار کر کے انہیں اپنے خاص بندوں میں بنا لینا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو غلبہ و کامرانی یا دشمنوں کو کچھ چوٹ لگانا اور نقصان پہنچانا جہاں مقاصد جہاد میں اللہ کے نزدیک شامل ہے وہیں ایک مقصد بعض بندوں کو درجۂ شہادت پر فائز کر کے ان کا اکرام کرنا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ہوگا جب کہ اللہ کی طرف سے ایسے مواقع پیدا کئے جائیں کہ مسلمان کفار کے ہاتھوں مارے جائیں۔

غالباً اسی لئے روایات اور تاریخ میں ایسے واقعات ہم کو نظر آتے ہیں کہ فتح و نصرت کا سوال کیا!؟ دشمن کو معمولی چوٹ لگانے کی امید نہیں ہوتی صرف مرکھپ جانے کے حالات ہوتے ہیں لیکن مسلمان کامل جذبۂ سرفروشی کے ساتھ معرکوں میں گھس جاتے ہیں۔ بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑانے اور کشتیوں کے جلانے اور کھجور کھاتے ہوئے کھجور پھینک دینے کی روایات اسی نقطۂ نظر کی علامت بن کر تاریخ اسلامی کے افق پر درخشاں ہیں۔

غزوہ اُحد کے بعد مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ○ (آل عمران ۱۴۰-۱۴۱)

ترجمہ: یہ ایام اسی طرح ہم لوگوں کے اندر اُلٹ پھیر کرتے رہتے ہیں تا کہ اللہ تمہارا امتحان کرے اور ممیز کردے ایمان والوں کو اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا اور تا کہ اللہ مومنوں کو چھانٹ کر الگ کردے اور کافروں کو مٹا دے۔

اس آیت میں وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ (یعنی تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید بنائے) کے ٹکڑے سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شہادت کا مرتبہ اتنا عظیم ہے کہ اس سے کچھ مسلمانوں کو نوازنا اللہ کی جانب سے

بطور اکرام ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ ظالموں سے محبت کرنے کی بناء پر مسلمانوں کے خلاف ان کو موقع دیتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو قتل کریں بلکہ اللہ یہ موقع اپنے بندوں کو ایک عظیم نعمت سے سرفراز کرنے کے لئے پیدا کرتا ہے۔ اس موضوع پر مزید روشنی کے لئے سورہ انفال کی مندرجہ ذیل آیت پر غور کیجئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَاۗءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ (الانفال:۱۶-۱۵)

ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم کافروں سے دوبدو مقابل ہو جاؤ تو ان سے پیٹھ مت پھیرو اور جو کوئی ان سے پیٹھ پھیرے گا مگر یہ کہ چال چلنا ہو لڑائی کے لئے یا جو اپنی جماعت کی طرف پناہ لیتا ہو وہ اللہ کے غضب میں آجائے گا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب اسلامی لشکر کی دشمنان دین سے مڈبھیڑ ہونے کی نوبت آجائے اور دونوں فریق آمنے سامنے ہوں اس وقت کسی مسلمان کے لئے پیٹھ پھیر کر بھاگنا حرام ہے۔ حدیث اور فقہ کی زبان میں اس کو ''فرار من الزحف'' کہا گیا ہے۔ حدیث رسول ﷺ کے مطابق فرار من الزحف گناہِ کبیرہ ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابوھریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: سات مہلک چیزوں سے بچو، عرض کیا گیا اللہ کے رسول ﷺ! وہ کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، معصوم کو قتل کرنا، یتیم کا مال کھانا، سود کھانا، جنگ کے دن پیٹھ پھیر کر بھاگنا، بے گناہ عورتوں پر تہمت لگانا۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کیساتھ کوئی عمل نفع نہیں دیگا۔ اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور فرار من الزحف۔ آیت کے لحاظ سے جنگ میں پیچھے ہٹنا صرف دو صورتوں میں جائز بتایا گیا۔

ایک یہ کہ جنگی چال کے طور پر کوئی پیچھے ہٹ جائے۔

دوسرے یہ کہ پیچھے اس لئے ہٹا جائے کہ مجاہدین کے کسی دستے سے مل کر پھر حملہ کرنا مقصود ہو۔

ان دو صورتوں کے علاوہ کسی صورت میں بھی دشمن کے مقابلہ سے پھر کر بھاگنا بڑا گناہ ہے خواہ دشمن کی تعداد اور قوت و شوکت کتنی ہی زیادہ ہو۔ جیسا کہ غزوۂ بدر میں اسلامی لشکر نے ایک ہزار دشمنوں کے مقابلہ میں تین سَو تیرہ ہونے کے باوجود ڈٹ کر مقابلہ کیا جبکہ ساز و سامان کے اعتبار سے بھی مسلمان کمزور حالت میں تھے۔ بعد میں سورۂ انفال کی آیت نازل ہوئی۔

اَلۡـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنۡکُمۡ وَعَلِمَ اَنَّ فِیۡکُمۡ ضَعۡفًا فَاِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ وَاِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ اَلۡفٌ یَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفَیۡنِ بِاِذۡنِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ○ (الانفال:٦٦)

ترجمہ: اب اللہ نے تمہاری ذمہ داری ہلکی کر دی اور اس نے جان لیا کہ تم میں کچھ کمزوری ہے سو اگر تم میں سو ثابت قدم رہیں گے تو دوسو پر غالب رہیں گے اور اگر ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب رہیں گے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے آسانی فرمادی ہے اور تمہاری کمزوری کے پیش نظر یہ قانون جاری کر دیا کہ اگر مسلمان سو ہوں اور وہ ثابت قدم ہوں تو وہ دوسو پر غالب آسکیں گے۔ یہاں پر ایک لحاظ سے بشارت دی گئی ہے۔ صراحت کے ساتھ بھاگنے کے لئے مذکورہ دونوں صورتوں کے علاوہ کوئی تیسری صورت نہیں بتائی گئی ہے۔ لیکن فقہائے اُمت نے اس سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اگر دشمن کی تعداد دگنے سے زیادہ ہو تو مقابلہ سے بھاگنا جائز ہوسکتا ہے۔ اس مقام پر یہ پہلو بہت ہی اہم ہے کہ فقہاء نے بھاگنے کے لئے صرف جواز کی بات کہی ہے۔ ان کے نزدیک بھاگنا واجب نہیں ہے۔ یعنی اگر دشمن کی تعداد دوگنی سے زیادہ ہو اور مسلمان نہ بھاگیں تو گناہ گار نہیں ہوں گے۔ کسی چیز کے محض جائز ہونے اور واجب ہونے کے درمیان جو فرق ہے اس کو سمجھنا چاہئے۔ عموماً اس جواز کو لوگ ایسا بیان کرتے ہیں جیسا کہ مقابلہ سے بھاگنا ضروری اور واجب ہو۔ جبکہ قرآن میں متعدد مقامات پر جانبازی اور اللہ کی راہ میں جان لڑانے کے لئے ترغیب دی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ کفار کی کثرت تعداد کو دیکھ کر گھبراؤ نہیں۔ اس لئے کہ اللہ کے حکم سے کوئی چھوٹی جماعت بھی بڑی جماعت پر غالب آسکتی ہے۔ فتح و کامیابی کا انحصار لشکر کی کمی بیشی پر نہیں ہے بلکہ اللہ کے اذن پر ہے۔ ساتھ ہی میں ان لوگوں کی تعریف اور مدح قرآن میں فرمائی گئی ہے جو بے باکی اور جانبازی کا مظاہرہ کرتے ہیں چنانچہ کہا گیا ہے کہ......

اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَکُمۡ فَاخۡشَوۡهُمۡ فَزَادَهُمۡ اِیۡمَانًا ۖۚ وَّقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰہُ وَنِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ○ (آل عمران:۱۷۳)

ترجمہ: وہ جن سے لوگوں نے کہا تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں ان سے ڈرو تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔

دوگنے سے زیادہ لڑنا اور ان پر حملہ کرنا زیادہ فضیلت کا باعث ہے۔ چنانچہ غزوۂ موتہ میں تین ہزار مسلمان دولاکھ کفار کے مقابلہ میں ڈٹے رہے۔ اس طرح کے واقعات سے اسلامی تاریخ بھری پڑی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دشمن کی تعداد دگنی سے زیادہ ہو تو بھاگنے کیلئے جواز تو ہے لیکن نہ بھاگنے کی افضلیت اپنی جگہ قائم ہے۔ چنانچہ اس جواز سے فائدہ نہ اٹھانے والوں کی ہمیشہ تحسین کی گئی ہے اور بزدلی اور فرار اختیار کرنے والوں کی مذمت گئی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ○ (آل عمران:۱۵۵)

ترجمہ: تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے تھے اللہ نے معاف کر دیا اور اللہ بہت درگذر کرنے والا اور بردبار ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت میں ایسے مسلمان کی تعریف کی گئی ہے...... جو گھوڑے کی پیٹھ پر گھوڑے کی لگام پکڑے اُڑتا پھرتا ہے اور جدھر شور سنتا ہے اُس طرف دوڑ پڑتا ہے اور اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتا۔

الغرض جان کی پرواہ کئے بغیر جو لوگ معرکہ حق و باطل میں کود پڑتے ہیں ان کی مدح و تحسین کی جاتی ہے۔ بمقابلہ ان کے جو اپنے کو بچا بچا کر رکھنے کی فکر میں پڑے رہتے ہیں۔

مصلحت درِ دین عیسیٰ غار و کوہ
مصلحت درِ دین ما جنگ و شکوہ

(مولانا رومیؒ)



اَلۡمُسۡتَضۡعَفِیۡنَ فِیۡ الۡاَرۡضِ



انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے آزادی پسند ہے۔ انسان ہر قسم کی غلامی، بے بسی اور دباؤ سے آزاد رہنا چاہتا ہے کسی کی ماتحتی، تابع داری اور محکومیت کو اگر وہ قبول کرتا ہے تو کسی مجبوری کے تحت قبول کرتا ہے۔ افراد کے علاوہ قومیں بھی غلامی کو اپنے لئے لعنت سمجھتی ہیں۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ نہ کسی فرد نے اور نہ کسی قوم نے غلامی اور بے بسی کی زندگی کو اپنے لئے مثال اور آئیڈیل زندگی قرار دیا ہو۔ انسان تو انسان کوئی چرند اور پرند بھی قید و بند اور پنجرے کی زندگی کو پسند نہیں کرتا۔ ذرا موقع ملا تو نو دو گیارہ ہو جاتا ہے۔ چرند پرند اور انسان تو درکنار اپنی جگہ ایک نرم و نازک پودا پتھر کے نیچے دبے ہوئے دانہ سے نکلتا ہے تو وہ بھی کسی نہ کسی طرح پتھر کے دباؤ سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ اس کے جسم کو کتنی بار ٹیڑھا ہونا پڑتا ہے۔ نکل نہیں پاتا تو مر جاتا ہے۔ دبے دبے رہ کر زندہ رہنا گوارا نہیں کرتا۔

غرض ہر ذی حیات خواہ پیڑ پودے نباتات ہوں یا زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے اور چوپائے ہوں یا فضا میں اڑنے والے پرندے ہوں سب کی فطری شریعت میں دب کر رہنا حرام اور ناپسندیدہ ہے۔

لیکن افسوس صد افسوس کہ اشرف المخلوقات اور وہ بھی مسلمان غلامی، محکومی اور بے بسی کی زندگی گزارنے کے لئے شرعی دلائل پیش کرتا ہے اور اگر کہا جائے کہ تمہارے ایمان کا تقاضا ہے کہ تم ہر طرح کے دباؤ، ہر طرح کی غلامی، محکومی اور تابع داری سے آزاد رہو تمہاری گردن میں صرف اللہ جل شانہ کی غلامی کا پٹہ ہو تو اللہ کی بندگی اور غلامی کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے کی غلامی کو قبول کرنے کا نظریہ نہیں چل سکتا۔ اللہ کی بندگی اور غلامی معتبر اس وقت ہوگی جبکہ تم ماسواء اللہ کی بزرگی کا قلادہ اپنی گردن سے نکال پھینکو گے۔ ورنہ اللہ کی بندگی کا دعویٰ تمہارے منہ پر مار دیا جائے گا، تو انسان کہتا ہے کہ نماز روزہ کرنے سے کون روکتا ہے اور وہ بندگیٔ رب اور بندگیٔ ماسواء اللہ

دونوں کو ایک ساتھ نبھانے کے لئے سو دلیل پیش کرتا ہے۔ یہ انسان بالخصوص ایک مسلمان انسان کی گراوٹ تنزلی اور پستی کی انتہاء ہے۔قرآن میں مستضعفین کا بیان یوں کیا گیا:......

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ○ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ○ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ○ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○

(النساء:۹۷-۱۰۰)

ترجمہ: جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے اُن کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے۔ بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کردے۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لئے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لئے بڑی گنجائش پائے گا، اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لئے نکلے، پھر راستہ ہی میں اُسے موت آجائے اُس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا۔ اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے۔

آیت کا تعلق پہلے سے یہ بتاتا ہے کہ اس کے پہلے جہاد کا اجر وثواب بتایا گیا اسی کے ساتھ ان کے عذاب کا ذکر ہے جو دیارِ کفر میں بیٹھے رہے اور جہاد میں شریک نہیں ہوئے۔ اس آیت میں غور کرتے وقت کئی سوال سامنے آتے ہیں۔

① انسان کی جان نکالنے کی نسبت کہیں اللہ کی طرف کی گئی ہے اور يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا کہیں ملک الموت کی طرف نسبت ہے۔ قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ اور یہاں ملائکہ کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ امام فخر الدین رازیؒ نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ موت کا خالق اللہ تعالیٰ ہے پھر موت

کا عمل ملک الموت کے ذمہ اللہ نے کیا ہے بقیہ سارے فرشتے ملک الموت کے مددگار ہیں۔

(۲) ظلم سے کیا مراد ہے۔ ظلم کا اطلاق کفر وشرک پر بھی ہوتا ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ اور معصیت پر بھی ہوتا ہے۔ اس آیت میں حالت استضعاف میں رہنے کو ظلم کہا گیا۔ ملائکہ کے سوال، فِيْمَ كُنْتُمْ کا کیا مفہوم ہے۔ امام رازیؒ نے تین باتیں اس ضمن میں کہی ہیں۔

(۱) تم اپنے دین کے معاملہ کی نسبت کس حالت میں ہو؟

(۲) اللہ کے نبی دشمنان سے لڑ رہے ہیں اس میں تمہاری کیا پوزیشن ہے؟

(۳) تم جہاد کو چھوڑ کر دیار کفر میں قیام پر کیونکر راضی ہو؟

ملائکہ کے سوال کا جواب تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ کہتے ہمارا یہ موقف ہے اور ہم یہ سوچتے ہیں یا آخر ہم سے یہ سوال کیوں کیا جاتا ہے؟ اس کے بجائے انہوں نے جواب دیا کہ ہم بے بس اور کمزور ہیں۔ اس جواب کے بعد ملائکہ نے جو بات کہی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ ان کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے اور کہا کہ اللہ کی زمین بہت وسیع تھی۔ تم کہیں بھی چلے جاتے۔

یہاں دو باتیں خاص توجہ کی طالب ہیں۔ حالت استضعاف میں رہنے کو کفر کے برابر بتایا گیا۔ کیونکہ مستضعفین کا انجام جہنم بتایا۔ اس لحاظ سے معاملہ کتنا نازک ہے۔ البتہ سارا انحصار احساس کی نزاکت پر ہے۔ ایک صحابی جندب بن ضمرہؓ نے جب یہ آیت سنی تو اپنے بیٹوں سے کہا۔ میں اب ایک رات بھی مکہ میں نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ بیٹوں نے انہیں چارپائی پر اُٹھا کر مدینہ کا رُخ کیا۔ آخر وہ راستہ میں ہی وفات پا گئے۔ حالانکہ قرآن نے ان مستضعفین کو عذاب جہنم کی وعید سے مستثنیٰ قرار دیا تھا جو حالت استضعاف سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں پاتے اور جنہیں استطاعت نہیں ہے۔

آیت کی تفسیر میں عام طور پر مفسرین نے نزول قرآن کے حالات کے پس منظر میں ساری بحث کی ہے جو بجائے خود صحیح ہے غلط نہیں۔ لیکن ہم کو یہ بات ذہن میں تازہ رکھنی چاہئے کہ قرآن کے الفاظ کا عموم ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ آیت کے اطلاق میں نزول قرآن کے حالات کے ساتھ قیامت تک کے حالات آ سکتے ہیں۔ مکہ ومدینہ کے حالات میں آیت محصور نہیں ہے۔ اس نقطہ کو عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور پھر ساری گفتگو دارالکفر اور دارالاسلام کی بحث میں آ کر پھنس جاتی ہے۔ دارالکفر اور دارالاسلام کی تعریف میں موشگافیاں پھر ان دونوں داروں کی نشاندہی میں مختلف رایوں کا جنگل سامنے آ جاتا ہے۔ نتیجہ میں قرآن کی روح غائب ہو جاتی ہے۔

حالانکہ قرآن کا منشاء یہ بتانا ہے کہ مسلمان کے شایان شان یہ نہیں کہ کفار ومشرکین کی محکومی میں زندگی

گزارے۔ بالخصوص جبکہ مسلمانوں کا ایک مرکز بن چکا ہو۔ یعنی کوئی مرکز کوئی جائے پناہ نہ ہو تو بھی غیر اللہ کے نظام اطاعت میں محکوم بن کر رہنا قابل مواخذہ جرم ہے اور جرم مزید سوا ہو جاتا ہے جب کوئی ایسا مقام موجود ہو جہاں اطاعت الٰہی کا نظام قائم ہے۔ یہ بات کوئی بہت علمی اور باریک بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ صاف اور سیدھی بات ہے کہ دو اطاعتیں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں۔ دنیا کے کسی سسٹم میں چاہے اس کی گنجائش نکل سکتی ہو لیکن اسلام میں تو اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ ہزار سجدے اللہ کیلئے کئے جائیں اور ایک سجدہ بھی غیر اللہ کیلئے کر دیا جائے تو وہ ہزار سجدے کالعدم اور بیکار ہو جاتے ہیں زندگی بھر اللہ اور رسول کی اطاعت کوئی کرے اور تھوڑی دیر کے لئے شیطانی گروپ کی خیر خواہی میں چلا جائے تو ساری اطاعتیں بے کار ہو جاتی ہیں کہ اللہ شرک اور ساجھے داری کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔ بعض اُمور میں بھی شریعت میں اسلام کے دشمنوں کی اطاعت کو ایمان کے خلاف اور ارتداد قرار دیا گیا ہے۔ (سورۂ محمد کی آیت ۲۸ کے مطابق)

حالت استضعاف کی ایک تصویر نزول قرآن کا زمانہ پیش کرتا ہے۔ ایک دوسری تصویر حضرت موسیٰ علیہ السلام، بنی اسرائیل اور فرعون کا دور پیش کرتا ہے فرعون بنی اسرائیل کے ساتھ جو سلوک کر رہا تھا اس کو استضعاف کے لفظ سے بیان کیا گیا: اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ (القصص:۴) استضعاف اور محکومی کی حالت میں کسی مسلمان گروہ کا ہونا اللہ کے نزدیک اتنا برا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے مقصد میں جہاں انسانوں کو شرک کی گندگی سے بچانا تھا وہیں فرعون کے تسلط محکومی سے نکالنا بھی تھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ کسی فرعون، کسی نمرود، کسی ابوجہل غرض اللہ کے کسی باغی کی اطاعت کا جوڑ اور پیوند نہیں لگایا جاسکتا۔ البتہ یہاں یہ سوال ہے کہ فرعون کی غلامی سے نکالنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے بطور خاص انتظام کیا اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضا اور عصاء کا معجزہ دے کر بھیجا۔ ممکن ہے کہ اس کے پیچھے فرعون کا حد سے گزر جانا اور بنی اسرائیل کی انتہائی مظلومیت اور بے کسی اور بے بسی رہی ہو۔ اور بنی اسرائیل پر رحم و کرم سے زیادہ فرعون کو سبق سکھانا رہا ہو۔ واللہ اعلم

اب آیت زیر بحث کی طرف قدرے تفصیل کے ساتھ ہم آتے ہیں اور مختلف مفسرین سے استفادہ کرتے ہیں۔ اپنے نفس پر ظلم کرنے اور محکومی کی حالت میں رہنے کا کیا مطلب ہے اور اس کی قرآنی نقطۂ نظر سے کیا حیثیت ہے؟ مولانا مودودیؒ کہتے ہیں:

> ''مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ابھی تک بلا کسی مجبوری و معذوری کے اپنی کافر قوم ہی کے درمیان مقیم تھے اور نیم مسلمانہ اور نیم کافرانہ زندگی بسر کرنے پر راضی تھے۔ درآنحالیکہ ایک دارالاسلام مہیا ہو چکا تھا جس کی طرف ہجرت کر کے اپنے دین و اعتقاد کے مطابق پوری اسلامی زندگی بسر کرنا ان کیلئے

ممکن ہو گیا تھا۔ یہی ان کا اپنے نفس پر ظلم تھا کیونکہ ان کو پوری اسلامی زندگی کے مقابلہ میں اس نیم کفر و نیم اسلام پر جس چیز نے قانع و مطمئن کر رکھا تھا وہ کوئی واقعی مجبوری نہ تھی بلکہ محض اپنے نفس کے عیش اور اپنے خاندان، اپنی جائیداد اور اپنے دنیوی مفاد کی محبت تھی جسے انہوں نے اپنے دین پر ترجیح دی۔''

یعنی جب ایک جگہ خدا کے باغیوں کا غلبہ تھا اور خدا کے قانون شرعی پر عمل کرنا ممکن نہ تھا تو وہاں رہنا کیا ضروری تھا؟ کیوں نہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسی سرزمین کی طرف منتقل ہو گئے جہاں قانونِ الٰہی کی پیروی ممکن ہوتی؟

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جو شخص اللہ کے دین پر ایمان لایا ہو اس کے لئے نظام کفر کے تحت زندگی بسر کرنا صرف دو ہی صورتوں میں جائز ہو سکتا ہے۔

ایک یہ کہ وہ اسلام کو اس سرزمین میں غالب کرنے اور نظام کفر کو نظام اسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتا رہے جس طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے ابتدائی پیرو کرتے رہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ درحقیقت وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو اور سخت نفرت و بیزاری کے ساتھ وہاں مجبوراً قیام رکھتا ہو ان دو صورتوں کے سوا ہر صورت میں دارالکفر کا قیام ایک مستقل معصیت ہے اور اس معصیت کے لئے یہ عذر کوئی بہت وزنی عذر نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا دارالاسلام پاتے ہی نہیں ہیں جہاں ہم ہجرت کر کے جا سکیں۔ اگر کوئی دارالاسلام موجود نہیں ہے تو کیا خدا کی زمین میں کوئی پہاڑ یا کوئی جنگل بھی ایسا نہیں ہے جہاں آدمی درختوں کے پتے کھا کر اور بکریوں کا دودھ پی کر گزر کر سکتا ہو اور احکام کفر کی اطاعت سے بچا رہے؟!

بعض لوگوں کو ایک حدیث سے غلط فہمی ہوئی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ''لا ھجرۃ بعد الفتح یعنی فتح کے بعد اب ہجرت نہیں ہے۔ حالانکہ دراصل یہ حدیث کوئی دائمی حکم نہیں ہے بلکہ صرف اُس وقت کے حالات میں اہل عرب سے ایسا فرمایا گیا تھا جب تک عرب کا بیشتر حصہ دارالکفر اور دارالحرب تھا اور صرف مدینہ اور اطراف مدینہ میں اسلامی احکام جاری ہو رہے تھے مسلمانوں کیلئے تاکیدی حکم تھا کہ ہر طرف سے ہٹ کر دارالاسلام میں آ جائیں۔ مگر جب فتح مکہ کے بعد عرب میں کفر کا زور ٹوٹ گیا اور قریب قریب پورا ملک اسلام کے زیر نگیں آ گیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہجرت کی حاجت باقی نہیں رہی ہے۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہ تھی کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کیلئے تمام حالات میں قیامت تک کیلئے ہجرت کی فرضیت منسوخ ہو گئی ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی وضاحت ملاحظہ فرمائیے:

''اب ان تمام غیر معذور مسلمانوں کو جواب تک دارالحرب میں پڑے ہوئے تھے ہجرت پر اُبھارا ہے اور یہ گویا ان کے لئے آخری تنبیہ ہے۔ اس کی تمہید اس طرح اُٹھائی ہے کہ جو لوگ اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود

بلا کسی شدید مجبوری و عذر شرعی کے اب تک دار الکفر میں پڑے ہوئے ہیں۔ اسی حالت میں ان کی موت آئی تو فرشتے ان سے سوال کریں گے کہ یہ تم کس حال میں پڑے رہے؟ یہ جواب دیں گے کہ ہم تو بے بس و مجبور تھے۔ فرشتے جواب دیں گے کیا خدا کی زمین میں تمہارے لئے کہیں سمائی نہیں تھی کہ تم وہاں ہجرت کر جاتے۔ پھر فرمایا کہ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔''

اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو حقیقتاً بے بس اور معذور ہیں۔ فرمایا، خدا کے ہاں معذور صرف وہ مرد، عورتیں اور بچے قرار پائیں گے جو نہ تو کوئی تدبیر کر سکنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ان کے لئے کوئی راہ کھل رہی ہے یہ لوگ اُمید ہے کہ اللہ ان سے درگزر فرمائے گا۔

اس کے بعد ہجرت کی راہ میں کمر ہمت باندھ کر اُٹھ کھڑے ہونے والوں کی حوصلہ افزائی فرمائی کہ جو اللہ کی راہ میں ہجرت کیلئے اُٹھ کھڑا ہوگا وہ خدا کی زمین میں بہت ٹھکانے اور بڑی وسعت پائے گا۔ آخر میں یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ ہجرت کے اجر عظیم کیلئے یہ ضروری نہیں کہ آدمی دار الہجرت میں پہنچ ہی جائے بلکہ صرف یہ کافی ہے کہ اللہ و رسول کی طرف ہجرت کے ارادے سے آدمی گھر سے نکل کھڑا ہو جو گھر سے نکل کھڑا ہوا اگر فوراً ہی اس کی موت ہوگئی یا وہ قتل کر دیا گیا تو اس سے اس کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اللہ کے اوپر اس کا اجر لازم ہوگیا۔

ان آیات سے ہجرت کے متعلق مندرجہ ذیل اُمور سامنے آتے ہیں۔

ایک یہ کہ ہر نقل مکانی ہجرت نہیں ہے۔ ہجرت یہ ہے کہ مسلمان ایک ایسے مقام کو جہاں اس کے لئے اپنے دین و ایمان پر قائم رہنا جان جوکھوں کا کام بن گیا ہو، چھوڑ کر ایک ایسے مقام کو منتقل ہو جائے جہاں اسے توقع ہو کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کر سکے گا۔

دوسرا یہ کہ دار الاسلام موجود ہو، اس کی طرف ہجرت کی راہ کھلی ہو، کوئی سخت مجبوری بھی نہ ہو تو ایسے مقام سے ہجرت کر کے دار الاسلام میں منتقل ہو جانا واجب ہے ورنہ ایسے شخص کا ایمان معتبر نہیں۔

تیسرا یہ کہ ہجرت کے معاملے میں ہر عذر، عذر نہیں ہے معتبر عذر یہ ہے کہ آدمی اتنا بے بس ہو کہ اس سے خود کوئی تدبیر بن آ رہی ہو نہ اس کے لئے کوئی راہ کھل رہی ہو۔ ایسی مجبوری میں بھی اس پر اپنے ایمان کی حفاظت بہر حال لازم ہے۔ اگرچہ اس کو اصحاب کہف کی طرح کسی غار ہی میں پناہ لینی پڑ جائے۔

چوتھا یہ کہ ہجرت کا اجر آخرت میں تو جو ہے وہ ہے دنیا میں بھی مہاجر کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص بدرقہ فراہم ہوتا ہے۔ خدا کی زمین اس کیلئے راہیں کھولتی ہے اور غیب سے اس کے لئے اسباب و سامان فراہم ہوتے ہیں۔

پانچویں یہ کہ اس راہ میں پہلا قدم بھی منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیت خالص اور ارادہ راسخ ہو تو گھر سے نکلتے ہی مہاجر کو موت آ جائے تو ہجرت کا اجر اس کے لئے لازم ہو گیا۔

علامہ شبیر عثمانیؒ لکھتے ہیں:

''بعضے مسلمان ایسے بھی ہیں کہ دل سے سچے مسلمان ہیں مگر کافروں کی حکومت میں ہیں اور ان سے مغلوب ہیں اور کافروں کے خوف سے اسلامی باتوں کو کھل کر نہیں کر سکتے۔ نہ حکم جہاد کی تعمیل کر سکتے ہیں سو ان پر فرض ہے کہ وہ وہاں سے ہجرت کریں اس رکوع میں اس کا ذکر ہے۔ آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں یعنی کافروں کے ساتھ مل کر رہ رہے ہیں اور ہجرت نہیں کرتے فرشتے ان سے مرنے کے وقت پوچھتے ہیں کہ تم کس دین پر تھے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو مسلمان تھے مگر بوجہ ضعف و کمزوری کے دین کی باتیں نہ کر سکتے تھے۔ فرشتے کہتے ہیں کہ اللہ کی زمین تو بہت وسیع تھی تم یہ تو کر سکتے تھے کہ وہاں سے ہجرت کر جاتے سو ایسوں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔''

ایک دوسری آیت پر غور کیجئے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ (النساء:۷۵)

ترجمہ: اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کیلئے جنگ نہیں کرتے جو دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس ظالم باشندوں کی بستی سے نکال اور ہمارے لئے اپنے پاس سے ہمدرد پیدا کر اور ہمارے لئے اپنے پاس سے مددگار کھڑے کر۔

اس آیت پر مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں

''مَا لَكُمْ'' ''تمہیں کیا ہو گیا ہے'' کا اسلوب کسی کام پر اُبھارنے اور شوق دلانے کیلئے ہے۔ **مستضعف** سے مراد مظلوم، مجبور اور بے بس کے ہیں۔ **مستضعفین کا عطف** ''فی سبیل اللہ'' پر اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جو لوگ دین کی وجہ سے ستائے جا رہے ہیں ان کی آزادی کے لئے جنگ (قتال فی سبیل اللہ) میں سب سے اول درجہ رکھتی ہے۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ اسلامی جہاد کا اصل مقصد دنیا سے فتنہ (Persecution) کو مٹانا ہے۔ ''قریۃ'' کو یہاں صرف مکہ کیلئے خاص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ان آیات کے نزول کے زمانے میں مکہ کے علاوہ اور بھی بستیاں تھیں جن میں بہت سے مرد، عورتیں اور بچے مسلمان ہو چکے تھے اور وہ اپنے کافر سرپرستوں یا اپنے قبیلے کے کافر زبردستوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے

ہوئے تھے۔ ’’مِنۡ لَّدُنۡكَ‘‘ کا موقع استعمال اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ بظاہر حالات تو بالکل خلاف ہیں، کسی طرف سے اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی لیکن اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور اپنی عنایت سے کوئی راہ کھول دے تو کچھ بعید نہیں۔‘‘

جہاد کیلئے ایک اہم محرک

مطلب یہ ہے کہ تم ان مردوں، عورتوں اور بچوں کو کفار کے ظلم وستم سے نجات دلانے کے لئے کیوں نہیں اُٹھتے جو کفار کے اندر بے بسی کی حالت میں گھرے ہوئے اور ان سے چھوٹ کر مسلمانوں سے آملنے کی کوئی راہ نہیں پا رہے ہیں جن کا حال یہ ہے کہ رات دن نہایت بے قراری کے ساتھ یہ دعا کر رہے ہیں کہ اے پروردگار ہمیں ان ظالم باشندوں کی بستی سے نکال اور غیب سے ہمارے ہمدرد پیدا کر اور غیب سے ہمارے مددگار کھڑے کر۔

آیت ۷۵ کے اشارات

’’اس آیت سے کئی باتیں ظاہر ہو رہی ہیں۔

ایک یہ کہ ظالم کفار نے کمزور مسلمانوں پر خود ان کے وطن کی زمین اس طرح تنگ کر دی تھی کہ وہ وطن ان کو کاٹے کھا رہا تھا اور باوجودیکہ وطن کی محبت ایک فطری چیز ہے لیکن وہ اس سے اس قدر بیزار تھے کہ اس کو ظالم باشندوں کی بستی کہتے ہیں۔ اس کی طرف کسی قسم کا انتساب اپنے لئے گوارا کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

دوسری یہ کہ کوئی وطن اسی وقت تک اہل ایمان کیلئے وطن کی حیثیت رکھتا ہے جب تک اس کے اندر ان کے دین وایمان کیلئے امن ہو۔ اگر دین وایمان کو اس میں امن حاصل نہ ہو تو وہ وطن نہیں بلکہ وہ خونخوار درندوں کا بھٹ، سانپوں اور اژدہوں کا مسکن اور شیطانوں کا مرکز ہے۔

تیسری یہ کہ اس زمانے میں حالات اس قدر مایوس کن تھے کہ مظلوم مسلمانوں کو ظاہر میں نجات کی کوئی راہ بھی سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ سارا بھروسہ بس اللہ کی مدد پر تھا کہ وہی غیب سے ان کے لئے کوئی راہ کھولے تو کھولے اس کے باوجود یہ مسلمان اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ اللہ اکبر! کیا شان تھی ان کی استقامت کی۔ پہاڑ بھی اس استقامت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

چوتھی یہ کہ اگر کہیں مسلمان اس طرح کی مظلومیت کی حالت میں گھر جائیں تو ان تمام مسلمانوں پر جو ان کی مدد کرنے کی پوزیشن میں ہوں جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ان کی مدد کے لئے نہ اٹھیں تو یہ صریح نفاق ہے۔‘‘
(تدبر قرآن)

اس آیت پر مختلف زاویوں سے اوپر کی سطروں میں ایک بحث آپ نے پڑھ لی۔ جو مسلمان استطاعت

والے ہیں ان کا فرض بتایا گیا اور انہیں ترغیب دی گئی کہ اپنے بے بس اور محکوم بھائیوں کو کفار کے ظلم و جبر سے نکالنے کیلئے لڑتے کیوں نہیں جبکہ تمہارے ایمان کا یہ عین تقاضا ہے۔ دوسری طرف بے بس اور مظلوم ومحکوم مسلمانوں کی سوچ اور فکر کیا ہونی چاہئے۔ اس کا بھی نمونہ پیش کر دیا گیا کہ ان کو کسی درجہ میں اطمینان وچین سے نہیں رہنا چاہئے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی بے چینی اور بے اطمینانی کی وجہ کیا صرف یہ تھی کہ کفار و مشرکین مار پیٹ رہے تھے اور طرح طرح کی اذیتیں دے رہے تھے۔ بالفرض اہل مکہ اگر مسلمانوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچاتے ان کی راحت کے سارے اسباب مہیا کرتے تو کیا وہ اطمینان کے ساتھ زندگی گزارتے؟ اور ان کے سامنے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا؟ اس سوال کا جواب اس کے سواء کچھ نہیں ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ ان کے سامنے اصل مسئلہ راحت وآرام کا نہیں تھا۔ اصل مسئلہ ایمانی تقاضوں کے پورا کرنے کا تھا۔ اگر یہ مسئلہ نہ ہوتا تو سارے مسائل حل ہو جاتے۔ وہاں مکہ میں جو مسائل پیدا ہوئے تھے ان کی وجہ ہی یہ تھی کہ وہ ایمان اور ایمان کے تقاضوں کے چھوٹے سے چھوٹے جزء کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ قریش کتنے فراخ دل تھے۔ بار بار انہوں نے کتنی تجویزیں پیش کیں لیکن مسلمان کچھ لینے اور کچھ دینے کیلئے تیار نہیں ہوئے۔ ان کو اعتراض یہ نہیں تھا کہ مسلمان ایک خدا کی عبادت اور خدا کے رسول کی اطاعت کیوں کرتے ہیں اعتراض اصل یہ تھا کہ ایک خدا کی عبادت کے ساتھ دوسرے خداؤں کی عبادت نہیں کرتے۔

اگر خود نہیں کرتے نہ کریں، دوسروں کو ایسا کرنے سے روکتے کیوں ہیں؟ اسی طرح رسول خدا کی اطاعت کے ساتھ دوسرے لیڈروں کی بھی اطاعت کیوں نہیں کرتے اور اگر خود نہیں کرتے نہ کریں دوسروں کو دوسرے لیڈروں کی اطاعت نہ کرنے کی دعوت کیوں دیتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں دعوتِ اسلامی کے دو جزء ہیں اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا اور اللہ ورسول کے علاوہ کسی دوسرے کی اطاعت نہ کرنا۔ خدا کی طرف سے آئی شریعت کی اتباع کرنا اور شریعت کے علاوہ ساری چیزوں کو چھوڑ دینا۔ ان میں سے کسی چیز کو مسلمان چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ اس طرح کفار ومشرکین کی ماتحت زندگی میں مسلمان کیلئے اذیت، تکلیف، پریشانی اور ایمان لازم وملزوم ہیں۔ اذیتوں سے نجات نہیں مل سکتی ہے نجات کی راہ صرف یہ ہے کہ ماتحتی اور محکومی کی زندگی سے نجات حاصل کی جائے یا پھر ایمان کے ایک جزء کو چھوڑ کر سیکولر بن کر سامان راحت ہی نہیں گورنر اور صدر جمہوریہ کے مناصب حاصل کر سکتے ہیں۔

ایمان کے تقاضے

ایمان کے تقاضے کیا ہیں؟ اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات ذہن سے نکال دینی

چاہئے کہ ایمان کے تقاضے بس اتنے ہیں کہ ایک شخص اپنی پرائیوٹ زندگی میں چند مراسم عبودیت ادا کرلے اور بقیہ زندگی چاہے جیسے گزارے۔ کاروبار، تجارت، معیشت اور سیاست کے میدان میں اسے اختیار ہے کہ من مانے طریقے اپناتا پھرے۔ حالانکہ ایمان قبول کرنے کے بعد زندگی کا ہر لمحہ اور زندگی کی ہر حرکت و عمل اسلام کے بنائے ہوئے دائرہ میں ہونا ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب:۳۶)

ترجمہ: کسی مومن مرد اور عورت کیلئے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فیصلہ کے بعد اپنے امر کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔

اہل ایمان سے مطالبہ ہے کہ وہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہوں۔ اپنی زندگی کا کوئی حصہ بھی کسی دوسرے کو نہ دیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً (البقرۃ:۲۰۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

زندگی کے کسی حصہ کو اسلام کے علاوہ کسی دوسرے کے تابع کرنے کا نام شرک ہے۔ اس مقام پر سوچئے کسی کے تابع بن کر زندگی گزارنے اور حالت استضعاف اور غلامی میں رہ کر کوئی کیسے پکا اور سچا مومن رہ سکتا ہے۔ اللہ اور رسول پر ایمان رکھتے ہوئے غیر الٰہی نظام کے تحت رہ کر ایمان کے تقاضوں کو کیسے پورا کر سکتا ہے؟؟ افسوس ہے کہ اس حقیقت کو آج سمجھا نہیں جا رہا ہے اور ذہن مسلسل غلامی کی زندگی گزارتے ہوئے ایسا بدل گیا ہے کہ اصل اسلامی زندگی کا تصور محال بن گیا ہے اور اللہ کی اطاعت کے ساتھ غیر اللہ کی اطاعت اور قرآن کی اتباع کے ساتھ غیر قرآن کی اتباع اور پیروی میں کوئی تضاد، تناقض اور ٹکراؤ محسوس نہیں ہوتا اور دینداری میں کوئی فرق نہیں آتا۔

بعض لوگ اس کے مقابلہ میں حبشہ کی مثال پیش کرتے ہیں جو کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ قرآنی آیات نص قطعی ہیں۔ اصولی حیثیت سے نص قطعی کے مقابلہ میں سیرت اور تاریخ کا کوئی واقعہ نہیں پیش کیا جا سکتا۔ شاہ نجاشی مسلمان ہو گئے تھے اس اعتبار سے حبشہ میں غیر مسلم اقتدار نہیں تھا دین و شریعت کا جو حصہ اس وقت تک نازل ہو چکا تھا اس کی پابندی بحیثیت مسلمان کرتے رہے ہوں گے۔ تیسرے وہ ایک اضطراری اور عارضی عمل تھا۔ حالات کے سدھرتے اور موقع ملتے ہی وہاں سے مسلمان واپس آ گئے۔

ایک قرآنی حقیقت جس سے آج اِنکار ہے



ایک مشہور دینی ماہنامہ کے شمارہ اپریل 2008ء میں ڈاکٹر عبدالمنعم ابوالفتوح کی کسی تحریر کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔ مترجم مسعودالرحمن خان ندوی ہیں۔ اس میں سید قطبؒ کے بارے میں ایک نہایت ہی غلط بات کہی گئی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ ظالم کفار سے جنگ کرنا تو اپنی جگہ صحیح ہے تو کیا ان کفار سے بھی جنگ جائز ہے جو مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے، ایذا نہیں پہنچاتے، لڑائی نہیں کرتے اور نہ مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالتے ہیں۔

اس مسئلہ میں سید قطبؒ کی رائے یہ ہے کہ ان سے بھی جنگ جائز ہے اس رائے کو صاحب تحریر نے عجیب وغریب کہا ہے نیز یہ کہا ہے کہ یہ ایسی بات ہے جو سید قطبؒ سے پہلے کسی اور عالم اور فقیہ نے نہیں کہی ہے۔ نہ تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سید قطبؒ کی بات عجیب وغریب نہیں ہے بلکہ ڈاکٹر عبدالمنعم کی بات عجیب وغریب ہے اور سید قطبؒ کی بات ہی ہر معتبر عالم اور فقیہ نے کہی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ سید قطبؒ کی تائید میں واقعات کا تسلسل ہے۔ نہیں معلوم یہ بات کیسے کہہ دی جبکہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۹۳ "وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ" میں فتنہ کے ختم ہونے تک جنگ کا عام حکم دیا گیا ہے اور سورہ توبہ آیت نمبر ۲۹ "قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ...وَلَا يَدِيْنُوْنَ...حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ" میں اہل کتاب سے جنگ کرنے کا حکم ادائے جزیہ تک دیا گیا ہے۔ اس طرح کی کھلی اور صاف آیات کی موجودگی میں سید قطبؒ کی رائے کو عجیب وغریب کیسے کہا جاسکتا ہے؟ زمانہ حال کے ایک عالم دکتور علی بن نفیع العلیانی کی تحریر کے چند جملے پڑھیے:

> "مستشرقین کے تلامذہ اور ان کی راہ اختیار کرنے والے لوگوں نے ایک گھناؤنی بدعت ایجاد کی ہے جو قرآن و سنت اور اجماع امت کے سراسر خلاف ہے وہ یہ کہ اسلام میں جہاد کی گنجائش صرف دفاع کیلئے ہے اور یہ کہ

کفار کو اسلام کے آگے جھکانے اور اللہ کے حکم کو غیروں پر غالب اور نافذ کرنے کیلئے جہاد کرنا جائز نہیں ہے۔ سوائے اس صورت میں کہ کفار مسلمانوں پر ظلم کرنے میں پہل کریں۔ یہ نظریہ ایک ایسا بدعتی نظریہ ہے کہ جس کو پہلے کے معتمد علماء میں سے کسی نے بھی نہیں کہا ہے۔‘‘ (بحوالہ اہمیۃ الجہاد ص: ۳۱۸)

اس کے بعد قدیم زمانہ یعنی چوتھی پانچویں صدی کے ایک فقیہ صاحب قدوری کا ایک جملہ پڑھئے: ’’قتال الکفار واجب ان لم یبدؤ نا‘‘، یعنی کفار سے جنگ واجب ہے اگر چہ وہ ہم سے جنگ نہ کریں۔‘‘

صاحب قدوری نے مزید لکھا ہے:

’’جب مسلمان دارالحرب میں داخل ہوں اور کسی شہر یا قلعے کا محاصرہ کرلیں تو وہاں کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں گے اگر وہ دعوت قبول کرلیں تو مسلمان ان سے جنگ سے رک جائیں گے۔ اگر وہ دعوت قبول نہ کریں تو جزیہ ادا کرنے کی دعوت دیں گے، اگر وہ جزیہ دینے کے لئے تیار ہوجائیں تو ان کے لئے وہ سب کچھ ہے جو مسلمانوں کے لئے ہے اور ان پر وہ سب کچھ ہے جو مسلمانوں پر ہے۔‘‘

دعوت کی بات پر قدوری کے حاشیہ میں ہے کہ یہ اس لئے کہ نبی ﷺ نے کسی قوم سے جنگ نہیں کی یہاں تک کہ ان کو اسلام کی دعوت دی۔ جنگ سے رکنے پر حاشیہ میں ہے کہ اگر وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں تو مقصد حاصل ہوگیا۔ چنانچہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہہ دیں۔ جزیہ کی ادائیگی پر حاشیہ میں نوٹ ہے کہ نبی ﷺ نے امراءِ لشکر کو ایسا ہی حکم فرمایا اس لئے بھی کہ قرآن میں حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ کہا گیا ہے یعنی ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں یعنی جزیہ دینے کیلئے تیار ہوجائیں تو جنگ سے رک جاؤ۔

جدید اور قدیم ان دونوں رایوں کے ہوتے ہوئے ڈاکٹر عبدالمنعم یا مسعود الرحمن خان کا یہ کہنا کہ یہ بات سید قطبؒ سے پہلے کسی عالم اور فقیہ نے نہیں کہی اور نہ تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہے۔ کہاں تک صحیح ہے؟ اور عجیب وغریب سید قطبؒ کی بات ہے یا ڈاکٹر عبدالمنعم کی؟

سید قطبؒ کی رائے کی معقولیت سمجھنے کے لئے جزیہ پر مزید سطریں ملاحظہ فرمایئے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے:

’’میں نے اس عبارت میں ایک تاریخی حقیقت کو بیان کیا ہے جس کی پشت پر نبی ﷺ کا اسوۂ حسنہ اور خلفائے راشدینؓ کا عمل موجود ہے۔ حدیث اور تاریخ کی کتابوں سے مجھے اس امر کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا کہ سلاطین روم وعجم کے خلاف فوج کشی سے پہلے ان ممالک میں صحابہ کرامؓ کو تبلیغی مہمات پر روانہ کیا گیا ہو اور پھر اس دعوت وتبلیغ کے نتائج کا انتظار کیا گیا ہو۔ نبی کریم ﷺ نے صرف سلاطین کو خطوط بھیجنے پر اکتفاء فرمایا اس کے ساتھ آپ ﷺ نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ براہ راست باشندگان روم وایران ومصر کو خطاب

کریں اوران کے جواب کا انتظار فرمائیں، خلفائے راشدینؓ کے عہد میں بھی صورت حال یہی رہی ہے۔ روم کی طرف پہلے غزوۂ موتہ پھر غزوۂ تبوک اور آخر میں جیش اسامہ کی مہم اس کی بین دلیل ہے۔ ایران کے خلاف حضرت ابوبکرؓ کی جنگ اور مصر پر حضرت عمرؓ کی چڑھائی بھی اسی کا ثبوت ہے۔

اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو اس کی وجہ بھی بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان ممالک کے عوام کو مخاطب کرنے کے بجائے صرف ان حکمرانوں سے کیوں خطاب کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان ممالک میں شخصی حکومتیں قائم تھیں اور مستبد فرمانروا اقتدار پر قابض تھے۔ ان کا برسر اقتدار رہنا ہی اشاعت اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ ان کی موجودگی میں نہ تو اس امر کا امکان تھا کہ دعوت عام باشندگان ملک میں پھیلائی جاسکے اور نہ عوام کو اتنی آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عمل حاصل تھی کہ اگر وہ اس دعوت کو حق پائیں تو اسے قبول کر کے اس پر عمل پیرا ہوسکیں۔ ان حالات میں حکمرانوں سے نمٹے بغیر نہ اسلام کی اشاعت کما حقہ سرانجام پاسکتی تھی اور نہ اس کے نتائج وثمرات رونما ہوسکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سلاطین کے نام اپنے مکتوبات مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر تم یہ دعوت قبول نہ کروگے یا ہماری اطاعت تسلیم نہ کروگے تو اپنی رعایا کی گمراہی کا وبال بھی تمہارے سر ہوگا۔

نبی ﷺ اور صحابہؓ کے اس عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی ملک میں ایسی حکومت قائم ہو جس کے ہوتے عوام کیلئے یہ عملاً ناممکن ہو کہ وہ دعوت اسلام سن کر قبول کرسکیں تو ایسی حکومت کو رستے سے ہٹانا ضروری ہے۔ اس حکومت کو ہٹانا دراصل عوام الناس کو عقیدہ وعمل کی آزادی بخشنے کا ہم معنی ہے۔ اس کا مقصود یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ اس کا مقصود صرف یہ ہے کہ ملک کے سیاسی نظام سے ان تمام موانع کا خاتمہ کردیا جائے جو حق کے ادراک اور اس کے اتباع میں مزاحم ہوتے ہیں۔''

(رسائل ومسائل، حصہ ۴، صفحہ: ۱۷۱)

صاحب تفہیم القرآن نے آیت ۱۹۳ میں جو نوٹ لکھا ہے وہ ملاحظہ فرمایئے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس مقام پر فتنے سے مراد وہ حالت ہے جس میں دین اللہ کے بجائے کسی اور کے لئے ہو اور لڑائی کا مقصد یہ ہے کہ فتنہ ختم ہوجائے اور دین صرف اللہ کیلئے ہو۔ پھر جب ہم لفظ دین کی تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں دین کے معنی اطاعت کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ نظام زندگی ہے جو کسی کو بالاتر مان کر اس کے احکام وقوانین کی پیروی میں اختیار کیا جائے۔ پس دین کی اسی تشریح سے یہ بات خود واضح ہوجاتی ہے کہ سوسائٹی کی وہ حالت جس میں بندوں پر بندوں کی خدائی وفرمانروائی قائم ہو اور جس میں اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے فتنے کی حالت ہے اور اسلامی جنگ کا مطمع نظر یہ ہے کہ اس فتنہ کی جگہ ایسی حالت قائم ہو جس میں بندے صرف قانون الٰہی کے مطیع بن کر رہیں۔''

(حاشیہ ۲۰۴، تفہیم القرآن جلد اول)

اس آیت کی تشریح پیش خدمت ہے:

''یعنی لڑائی کی غایت یہ نہیں ہے کہ وہ ایمان لے آئیں اور دین حق کے پیرو بن جائیں بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ ان کی خود مختاری و بالا دستی ختم ہو جائے۔ وہ زمین میں حاکم اور صاحب امر بن کر نہ رہیں بلکہ زمین کے نظام زندگی کی باگیں اور فرمانروائی و امامت کے اختیارات...... دین کے ہاتھوں میں ہوں اور ان کے ماتحت تابع و مطیع بن کر رہیں...... اور بھی صاف بات یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے دین کو اختیار نہیں کرتے اور اپنی...... نکالی ہوئی غلط راہوں پر چلتے ہیں وہ بس اتنی ہی آزادی کے مستحق ہیں کہ خود غلطی کرنا چاہتے ہیں کریں لیکن انہیں اس کا قطعاً کوئی حق نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر کسی جگہ بھی اقتدار و فرمانروائی کی باگیں ان کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کا نظام اپنی گمراہیوں کے مطابق قائم کریں اور چلائیں۔ یہ چیز جہاں کہیں ان کو حاصل ہوگی فساد رونما ہوگا اور اہل ایمان کا فرض بن گیا کہ ان کو اس سے بے دخل کرنے اور انہیں نظام صالح کا مطیع بنانے کی کوشش کریں۔'' (حاشیہ ۲۸، تفہیم القرآن، جلد دوم)

